بتقریب جشن سیمین مبارک اعلیٰحضرت بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی



خزینۂ تاریخ

یعنی

بزم تاریخ جامعہ عثمانیہ کا گلدستۂ مضامین

مدیر: محمد عبدالوہاب سلمؔ

ناشر

مجلس کابینہ بزم تاریخ جامعہ عثمانیہ

قیمت ۱۲؍

عہدہ داران بزم ۱۳۴۴ تا ۱۳۴۵ ف

صدر ناظم

پروفیسر ہارون خاں شیروانی۔ ایم۔ اے (آکسن) بار ایٹ لا۔ ایف۔ آر۔ ایچ۔ ایس (لندن)

ناظم مستوفی

پروفیسر جمیل الرحمن ایم۔ اے (پنجاب)

ناظم ادارہ

ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈی۔ لٹ (پیرس)

نظماء

پروفیسر کرشن چندر رائے سکسینہ ایم۔ اے (الہ آباد) پروفیسر عبدالمجید صدیقی ایم اے ال ال۔ بی (عثمانیہ)

ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی مولوی سراج الدین احمد ایم۔ اے رسرچ (عثمانیہ)

صدر:۔ ایشور چندر دیا ساگر متعلم ایم۔ اے معتمد: ہنمنت راؤ مانوی کر متعلم بی۔ اے

نائب معتمد: میر عباس علیخاں متعلم بی۔ اے خازن: جمیل احمد برنی متعلم بی۔ اے

اراکین

میر امجد علی خاں رام چندر نایک

مدیر: محمد عبدالوہاب تسلیم متعلم ایم۔ اے

فہرست مضامین خزینہ تاریخ

جوبلی نمبر

سنہ ۱۳۴۶ ف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ملاحظات

قانون فطرت ہے کہ جمود، پستی اور خواب کے بعد قومی زندگی کے افق پر بیداری کا ستارہ صبح نمودار ہوکر پیغام زندگی لاتا اور رہنمائے حیات بنتا ہے۔ انھی کے تاریک پردے اُٹھتے ہیں، دھندلے نقوش رفتہ رفتہ نمایاں اور آخر کار منور ہو جاتے ہیں۔ آفتاب طلوع ہوتا اور اسلاف کے درخشاں کارناموں پر نظر پڑتی ہے۔ زندگی نام ہے احساس کا، اور احساس کا دوسرا نام روح جس کی بیداری کے ساتھ ہی ماضی کے آئینہ میں مستقبل کی جھلک نظر آتی ہے۔ "ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے" پر غور کرنا گویا اس امر کا فیصلہ کرنا ہے کہ ہم کیا کر سکتے اور کیا ہو سکتے ہیں۔ اس وقت ایک رجز خواں، ایک مصلح، ایک شاعر یا مفکر پیدا ہوتا ہے۔ ایک جون آف آرک، ایک جمال الدین افغانی، ایک کمال یا مسولینی پیدا ہوتا اور قوم کی رگ رگ میں بیداری کی روح اور آزادی کا ولولہ پھونک دیتا ہے "شام غم" صبح عید کی خبر دیتی اور ظلمت شب میں امید کی کرن نظر آتی ہے۔ برسوں کی سوئی ہوئی قوم انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوتی اور پکار اٹھتی ہے ؎

خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر
تو عصا افتاد سے پیدا مثال دانہ کر

جس طرح پہاڑی چشمے آغوش کوہ میں بیدار ہو کر اور بحر سے ہمکنار ہونے کو

زور وشور سے مچلتے، تیخیتے، چلاتے، چٹانوں کو توڑتے سمندر کی طرف روانہ ہوتے ہیں، اسی طرح برسوں کی سوئی ہوئی قوم بھی ہشیار ہوکر آہنی دیواروں کو توڑتی ہوئی منزل مقصود کی طرف بڑھتی ہے، جس طرح پہاڑی چشمے میدانوں میں پہنچ کر آہستہ خرام ہوجاتے ہیں، اسی طرح قومیں بھی ترقی کی تگ و دو میں معراج تمدن پر پہنچ کر، جسے ان کی جوانی کا دور کہنا چاہیئے، میٹھے اور سُریلے نغمے گاتی ہوئی میدان عمل میں گامزن ہوتی ہیں۔ قوموں کا بھی بچپن، شباب، اور بڑھاپا ہوتا ہے، ایک دور کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا دور آتا اور ختم ہوتا ہے، جس کے بعد از سرِ نو پہلا اور اس کے بعد دوسرا اور تیسرا آتا ہے۔ اس قانون فطرت پر اسی طرح عمل ہوتا آیا ہے اور یونہی بقیٔ دنیا تک ہوتا رہے گا۔

دنیا کے طور وطریق نرالے ہیں اور فطرت عجب ستم ظریف ہے کہ ہر متمدن قوم کی تباہی ایک وحشی اور غیر متمدن قوم کے ہاتھوں عمل میں آتی ہے، ایرانیوں اور یونانیوں کو رومیوں نے تباہ کیا، رومیوں کو عربوں نے نیچا دکھایا اور عربوں کا خاتمہ تاتاریوں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ قدیم دراوڑی تہذیب کی تباہی جس کی عظمت کی گواہی جدید اکتشافات دے رہے ہیں، آریائی وحشیوں کے ہاتھوں عمل میں آئی، پھر یہی آریہ تمدن و تہذیب کی معراج پر پہنچ کر "ہمالیہ پار" کے وحشی فاتحوں کے ہاتھوں تباہ ہوئے، جن کے متعدد گروہ یکے بعد دیگرے آئے اور اپنے پیشرو فاتحوں کو جنوب میں ڈھکیل دیا چنانچہ آج دکن میں ہر رنگ ونسل اور ہر مذہب وملت کے باشندے موجود ہیں۔ گورے چٹے آریائی برہمنوں کے ساتھ دراوڑی سیاہ فام گونڈ، اور بھیل، سامی نسل کے سُرخ وسفید عربوں کے دوش بدوش منغولستان کے زرد فام تاتاری اور افریقہ

کے حبشی اس گہوارۂ تمدن میں نظر آتے ہیں۔ ان سب کے بعد فرنگیوں نے قدم جمائے جن میں سے بعض کو یہاں کی خاک ایسی دامنگیر ہوئی کہ یہیں کے ہو رہے، موسیو ریمو سے موسیٰ رحمو بن گئے اور آج بھی اسی دلکش فضا میں چین سے ابدی نیند سو رہے ہیں، نہ اُٹھنے کی خواہش معلوم ہوتی ہے اور نہ جاگنے کی تمنا۔

کاکاتیا، پانڈیا، اور چولا خاندانوں نے عظمت و شان کے گیت گائے۔ بہمنی خاندان اور پھر اس کی شاخوں نے بھی اپنے جاہ و جلال کے ڈنکے بجائے فاتحوں نے کبھی سونے اور جواہرات کی کانوں پر نظر ڈالی اور کبھی سکندر ثانی بننے کی کوششیں کیں، لیکن جو آیا یہیں کا ہو رہا اور اس طرح وہ تمدن پیدا ہوا جسے آج ہم حیدرآبادی تمدن کہتے ہیں۔ اس تمدن میں دراوڑی، آریائی، اور سامی یا ہندی، ایرانی اور عرب برابر کے شریک ہیں اور اسی طرح ہندو، بدھ، جین، مسلمان سکھ، پارسی اور عیسائی سب نے مل کر اس درخت کی آبیاری میں حصہ لیا ہے۔

ہمارا ماضی شاندار تھا، پستی کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ کیا ہم قوم کو اسی حال میں چھوڑ دیں؟ دل اس کا مشورہ نہیں دیتا۔ عقل اس کی مخالفت کرتی ہے۔

آقائے ولی نعمت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے آفتاب بن کر جہالت کے تاریک پردوں کو اپنے دستِ کرم سے اُٹھا دیا ہے، صبح ہو چکی ہے اور اندھیرا کافور، سامنے پیش رو کاروانوں کی گرد نظر آ رہی ہے، ساربانوں کے حیات انگیز نغمے یقین دلا رہے ہیں کہ یقیناً گرد و غبار کے ہٹنے پر اگر ہم بھی بڑھے چلیں تو صرف "محمل لیلیٰ" ہی نہیں بلکہ خود "جلوۂ لیلیٰ" ہماری نظروں کے روبرو ہوگا۔ خواب کا دوسرا نام موت ہے، طائروں نے زمزمے شروع کر دیئے، شبنم منزلِ مقصود کو روانہ ہو چکی کلیوں نے چٹک چٹک کر

برگ گل کی زبان سے چمن کی شادابی اور سرسبزی کے ترانے گانے شروع کر دیے گراں خوابی کا زمانہ گیا۔ دوستو! اٹھو اور اپنے آفتاب کی مدح میں ترانے گاؤ، خود ہشیار رہو اور دوسروں کو بیدار کر دو۔

سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے لطف و کرم سے جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تشنگان علم کی پیاس بجھنے کا سامان ہوا، بادۂ علم کے دلکش ساغر کا دور چلنے لگا اور قومی جسم کے رگ رگ میں زندگی کی روح سرایت کر گئی تاریخ بہترین رہنما ہے۔ جامعہ میں بھی بزم تاریخ نے دوسری انجمنوں یہاں تک کہ انجمن اتحاد کی بھی رہنمائی کی اور اپنی مختصر سی زندگی میں ایسے سپوت پیدا کیے جنھوں نے بڑے بڑے دعوے کرنے والی ہندوستانی جامعات کے مقابلہ میں جامعہ کا لوہا منوالیا۔ وہ لوگ جو اس جرات رندانہ کا مذاق اڑاتے اور خدانخواستہ اس کی ناکامی کا خواب دیکھتے تھے آج انگشت بدنداں نظر آتے ہیں۔ ہم کو فخر ہے کہ ہماری بزم کے اراکین ملک کی علمی اور عملی زندگی میں نمایاں حیثیت رکھتے اور مالک و مالک کی خدمت میں مصروف ہیں۔

آقائے ولی نعمت کے مبارک جشن سیمیں سے ایک سال پہلے ہم اس قابل ہوئے کہ شہر کے کرایہ خانوں کو چھوڑ کر اپنے علمی گہواروں میں خواہ وہ عارضی ہی کیوں نہ ہوں پہنچ جائیں جشن سیمیں کے مبارک سال میں ہم اس قابل ہو گئے کہ ان عارضی گھروں کو خیرباد کہیں اور ان شاندار محلات میں فروکش ہو کر حصول علم میں کوشاں ہوں جنھیں سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے مرحمت خسروانہ سے اپنی اولاد معنوی کے لیے تیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

شعبہ تاریخ حسب سابق علمی تحقیقات میں مصروف ہے ہمارے بعض پروفیسر
احبان نے جشن سیمیں کی مُبارک یادگار کے طور پر دکن کی ایک بسوط تاریخ لکھنے
بیڑا اُٹھایا ہے، مسرت ہے کہ نظام کالج کے پروفیسر ہنمنت راؤ صاحب بھی آ
میں تعاون کر رہے ہیں یہ کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت اہم اور
کھا ہوگا۔ تاریخ دکن پر اب تک جو تحقیق ہوئی ہے وہ اس قدر تشنہ ہے کہ عرصہ
ے اس کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اس متحدہ کام کے علاوہ انفرادی طور
ی کام ہو رہا ہے۔ مثلاً پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی اسلامی نظریات
سی کے متعلق، نیز تاریخ دکن پر تحقیقات کر رہے ہیں جس کے بعض حصے مقالات
سکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر جمیل الرحمٰن صاحب "بنی اُمیہ اور سلطنت بنیزطین کے تعلقات" پر
ق فرما رہے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب، نظام الملک بہادر آصفجاہ اوّل کی تاریخ
پلے تین سال سے کام کر رہے تھے اور ہمیں یہ اعلان کرنے میں خوشی ہے کہ ان کی
ب عنقریب شائع ہو جائے گی۔

مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی (عثمانیہ) نے سلاطین
ں پر بہت کچھ تحقیق فرمائی ہے جس کے متعلق چند مضامین بعض رسائل میں شائع ہو چکے
ہمیں اُمید ہے کہ بہت جلد وہ اپنی اعلیٰ تحقیقات اہل علم کے سامنے پیش کر سکینگے۔
"ڈاکٹر ایشور ناتھ صاحب ٹوپا، "قرون وسطیٰ میں ملوکیت کی مختلف کیفیات" پر بہت
ق کر چکے ہیں اور اُمید ہے کہ اس موضوع پر بہت جلد اُن کی تصنیف اہل علم کے

سامنے پیش کی جاسکے گی۔
مولوی سراج الدین صاحب نے "علاء الدین خلجی پر تحقیق" مکمل کرلی ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ اسی سال وہ ہمارے جامعہ کے زمرہ اساتذہ میں شریک ہوگئے ہیں۔

امسال حسب ذیل طیلسانین نے اپنے مقالات تقریباً تکمیل کو پہنچا دیئے ہیں

(۱) علی محسن صاحب (ایم۔ اے)		سلطنت گولکنڈہ کا زوال
(۲) بشیر حسین صدیقی بی۔ اے		جنگ کھرڈلہ
(۳) ابونصر خالدی	"	نظام الملک طوسی
(۴) ونکٹ راؤ	"	مہدجی سندھیا

ہمیں یہ دیکھ افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے طیلسانین ہر سال نہایت محنت اور تحقیق سے مختلف موضوعات پر مقالے لکھتے ہیں لیکن ان کی تحقیقاتیں منظر عام پر نہیں آتیں۔
اس وقت جو مقالے تیار موجود ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

مقالہ	مقالہ نگار	
(۱) حجاج بن یوسف	میر سیادت علیخاں صاحب	
(۲) عرب اور موالی کے تعلقات اور خلافت پر ان کا اثر	عبدالمجید صدیقی	"
(۳) فیروز شاہ تغلق	بھارت چند	"
(۴) دور شاہجہانی میں تمدنی ارتقا	خواجہ منیر الدین	"
(۵) عہد معاونت اور حیدرآباد	میر مخدوم علی	"

ہمیں امید ہے کہ ارباب جامعہ اور خصوصاً جناب پرو وائس چانسلر صاحب
ں طرف توجہ کریں گے اور ان کی اشاعت کا انتظام کرکے اہل ذوق کو مستفید
نے کا موقعہ دیں گے۔ فی الحال مجلہ عثمانیہ کے چند صفحات مختص کرکے یہ کام لیا جا سکتا ہے

گذشتہ سال بد قسمتی سے ہمارے ایک نہایت ہی عزیز اور لائق استاد جناب
وفیسر ابن حسن صاحب داغ مفارقت دے گئے۔ مرحوم اپنے حسن اخلاق، تبحر علمی اور
سعت نظر کے باعث طلبہ میں بہت مقبول تھے کل ۳۰ سال عمر پائی، لیکن اس مختصر
ی زندگی میں اتنا کچھ کر گئے کہ بوڑھے بھی رشک کریں تو بیجا نہ ہوگا۔ زندگی میں ہمارے
ے شمع ہدایت تھے ہی، وفات کے بعد بھی ان کی یاد ہماری رہنما ہے۔

سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی نظر کرم نے اس سال جامعہ علیگڈھ کی امارت قبول فرماکر اس
ے بیڑے کو عین منجدھار سے نکال لیا۔ سالہائے سابق کی طرح اس مرتبہ بھی ایک جماعت
طلبائے تاریخ کی نمایندہ تھی مع چند پروفیسر صاحبان کے حیدرآباد آئی جناب صدر
لم صاحب بزم تاریخ اور اراکین بزم نے خاص دلچسپی لیکر ممالک محروسہ سرکار عالی
ے جتنے تاریخی مقامات ممکن تھے دکھائے اور اس طرح جامعہ عثمانیہ اور جامعہ علیگڈھ
ے پرانے مراسم میں ایک نئی روح پھونکی، ہمیں امید ہے کہ آیندہ بھی ان دونوں
معات میں ہمیشہ ایسے ہی خوشگوار تعلقات باقی رہیں گے۔

نہ بیجا نہ ہوگا اگر اس موقعہ پر جناب پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی صدر ناظم

بزم تاریخ کا شکریہ نہ ادا کروں جنھوں نے ہمیشہ بزم کے معاملات میں خاص دلچسپی لی اور اس کے ساتھ ہی اپنی طرف سے "سلطان العلوم خسرو دکن خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کے مبارک عہد حکومت" پر بہترین مضمون لکھنے والے صاحب کو طلائی تمغہ مرحمت کرنے کا اعلان کیا۔

جامعہ کے سابق طالب علم اور موجودہ پروفیسر مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب اور جناب ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب کی عنایتیں اور "خزینۂ تاریخ" سے دلچسپی ایسی نہیں کہ انھیں بغیر شکریہ کے نظر انداز کر دیا جائے جامعہ کے ان دو استادوں نے مجھے ہر قسم کی مدد پہنچا کر خاص طور پر ممنون فرمایا ہے، گو ان کے علاوہ دوسرے اساتذہ کی عنایتیں بھی شامل حال رہیں ——— ان احباب اور عنایت فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنھوں نے میری درخواست پر اپنے مضمون عنایت فرما کر "خزینۂ تاریخ" پیش کرنے کا موقع دیا۔

آخر میں میرا خوشگوار فریضہ ہے کہ آقائے ولی نعمت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کی خدمت اقدس میں ان جذبات عقیدت اور مودت کو پیش کرنے کی جرأت کروں جو طلبا اور اراکین بزم تاریخ کے دلوں میں جاگزیں ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں سلطان العلوم کے جشنہائے طلائی اور الماسی منانے کا موقع دے۔ آمین

زندہ باد سلطان العلوم۔ پایندہ باد سلطنت دکن

محمد عبدالوہاب مسلم

عہد عثمانی

گذشتہ پچیس سال میں رفتار عالم کو جو نشیب و فراز پیش آئے ان میں اہل نظر کے واسطے دعوت فکر بھی ہے اور سرمایۂ عبرت بھی۔ جنگ عظیم دنیا کی حیات اجتماعی کے لیے بمنزلہ ایک زلزلہ تھی جس نے بڑی بڑی مستحکم حکومتوں کی بنیادیں ہلادیں۔ ملکوں کے حدود اربعہ بدل گئے۔ نئی مملکتیں وجود میں آئیں، سرسبز و شاداب علاقوں میں خاک اُڑنے لگی، لاکھوں حوصلہ مند نوجوان اپنی آرزوں کے ساتھ پیوند خاک ہوئے، خون اور آگ کے طوفان میں اللہ کی زمین چار برس تک محشرستان آہ و نالہ بنی رہی۔ لاکھوں بچے یتیم اور لاکھوں سہاگنیں بیوہ ہوگئیں۔ اسی خوفناک عفریت کے ہاتھوں نہ تاجداروں کے تاجوں کی اور نہ آزادوں کی آزادیوں کی خیریت رہی۔ بساط زندگی کے نقشے پر اپنے خونین موقلم سے نقاش جنگ نے جو اُلجھے ہوئے خطوط بنائے تھے انھیں صلح نے کہیں تو مسخ کر ڈالا اور کہیں اور زیادہ اُلجھا دیا۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جو اس ہنگامۂ رستاخیز سے متاثر نہ ہوا ہو دنیا اب وہ پرانی دنیا نہیں رہی۔ سائنس نے سیاست و معیشت عالم کو سمیٹ کر یکجا کر دیا ہے۔ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی طنابیں ایسی کھنچی ہیں کہ بعد مکانی کی کوئی حقیقت ہی باقی نہیں رہی۔ اور ملکوں کی طرح ہندوستان کو بھی جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ اگرچہ اس کی شرکت بالواسطہ تھی۔

جنگ جماعتی قوائے فکریہ کو شدت کے ساتھ ایک نقطہ پر مرکوز کر دیتی ہے

اس لئے کہ ذراسی توجہ بٹنے سے حیات ملی خطرہ میں پڑجاتی ہے۔ اس داخلی شدت فکر سے احساس انفرادیت اپنا نمو حاصل کرتا ہے۔ اہل ہند اگرچہ جنگ عظیم میں سخت کوشی کی گھاٹی میں دوسروں کے سہارے گذرے، پر انھوں نے اپنی آنکھوں سے دوسروں کو گرتے پڑتے اور سعی و جہد کرتے دیکھا۔ خود بھی ان سے جو کچھ بن پڑا وہ انھوں نے کیا، جذبہ و احساس کے تحت نہیں بلکہ گرسنہ مزدور کی حیثیت سے۔ بہرنوع یہ تجربہ بجائے خود ان کے قوائے فکریہ کو متحرک کرنے کا موجب ہوا۔ اور دوسری پسماندہ اقوام کی طرح انھوں نے بھی محسوس کیا کہ وہ بھی ایک جماعتی ہستی رکھتے ہیں۔ جنگ کے تازیانہ نے ان کی چشم ملت کو کھول دیا اور اسے تھوڑی بہت بصیرت بھی دی۔ جنگ کے بعد اس احساس ذات کے مظاہر ہمیں سیاست، معاشرت، تعلیم غرضکہ زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتے ہیں۔

ممالک محروسہ بھی ہندوستان کے جسم کا ایک حصہ ہے۔ اور جغرافی اور معنوی حیثیت سے اس کو بمنزلہ دل تصور کرنا غلط نہ ہوگا۔ جو احساس رگ رگ اور نس نس میں پیوست ہو کر رہ جائے بھلا اس کے اثر سے دل کیسے بچ سکتا ہے۔ اسے درحصل خوش نصیبی سمجھنا چاہیے کہ جنگ اور بعد جنگ کے صلح کے ہنگاموں میں جبکہ زندگی کی ساری پرانی قدریں دنیا بھر میں الٹ پلٹ رہی تھیں، سلطنت آصفیہ کے نظم حکومت کی باگ ڈور ایک ایسے صاحب تدبیر کے ہاتھ میں رہی جو زمانے کے نشیب و فراز سے آگاہ اور نبض کائنات کی ہر جنبش کو محسوس کرنے کی خلقی صلاحیت رکھتا ہے۔ جس کی جامع شخصیت پر علم و عمل کی دنیا جس قدر بھی ناز کرے بجا ہے۔ اس کے فہم و ادراک پر عقل حیران اور اس کے احساس پر وجدان تصدق ہے۔ اس کی جامع شخصیت علم و عمل

کے میدان میں ایک طرف مشرق و مغرب کے اعلیٰ ترین امتزاج کا نمونہ پیش کرتی ہے تو دوسری طرف اسلامی اوصاف حمیدہ کی حامل ہے۔ اس کی سادگی، فیاضی اور حوصلہ مندیوں سے مسلمانوں کے شاہان سلف کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اس کی نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ اس کی سلطنت اسلامی تاجداران ہند کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ چنانچہ خود فرمایا ہے ؎

سلاطین سلف سب ہو گئے نذر اجل عثماںؔ
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

جنگ اور اس کے بعد کے ہنگامہ خیز زمانے میں حضرت اقدس و اعلیٰ نے سلطنت کے نظم و نسق کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لیا اس لئے کہ ایسے نازک زمانے میں صدر عالمہ کو انتظام مملکت کی جزئیات پر بھی حاوی ہونا ضرور ہوتا ہے۔ لیکن جب دنیا کے دوسرے ملکوں میں امن و عافیت کا نقشہ جمنا شروع ہوا تو ذات شاہانہ نے یہ محسوس فرما کر کہ عمدہ نظم و نسق کے لئے یہ لازمی ہے کہ مختلف صیغہ جات حکومت کے باہمی تعلقات کو ایک معین اصول پر مبنی قرار دیا جائے، ایک دستور اساسی کا اعلان فرمایا جو اس وقت تک جملہ حکومتی ضروریات پر حاوی ہے۔ رعایا کی خوش حالی اور تمول ذات شاہانہ کے ہمیشہ مرکوز خاطر رہا ہے۔ آصفجاہیوں کو ہمیشہ بلا امتیاز نسل و مذہب اپنی رعایا کی ہر دلعزیزی حاصل رہی۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ انھیں کی بدولت سرزمین دکن میں بدامنی کے عفریت کا سر کچلا گیا اور مشاغل امن کو فروغ کا موقع ملا۔ کچھ تعجب نہیں کہ جذبۂ شکر گذاری عوام کے دلوں میں نسلاً بعد نسل چلا آرہا ہے اور وہ اپنے پادشاہ کو تدبیر و اصلاح اور امن و عافیت کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت

جہاں پناہی کی نظر دور بین اور فکر رسا سے یہ امر پوشیدہ نہیں رہا کہ ملک کے مادی ذرائع کی ترقی کا انحصار مختلف انتظامی سررشتوں کے باہمی تعاون عمل پر ہے۔ ذات شاہانہ نے ان نقائص کو محسوس فرما کر جو نظم و نسق میں رخنہ انداز ہو رہے تھے تنظیم جدید کا ارادہ فرمایا تاکہ اس قوت کے قیام کا جس پر ترقی کا انحصار ہے، خاطر خواہ تعین اور استحکام ہو جائے۔ یوں تو آصفجاہی حکومت کا مستقل ضابطہ اور روایات حضرت آصفجاہ اول کے وقت سے چلی آ رہی ہیں لیکن تحریری دستور اساسی پہلی دفعہ ۱۸۹۲ء میں حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں مرحوم کے عہد حکومت میں "قانونچہ مبارک" کے نام سے مرتب اور نافذ ہوا۔ قدیم آصفجاہی روایات کے مطابق اس کی تشکیل میں یہ اصول کار فرما رہا کہ حتی المقدور نظم و نسق میں سہولت اور رعایا کی آسائش میں اضافہ ہو۔ چنانچہ اس اصول کے مدنظر انتظامات حکومت ایک کونسل آف اسٹیٹ (مجلس مملکت) کے تفویض کئے گئے جسے مقننہ اور عاملہ دونوں کے اختیارات حاصل تھے لیکن تجربہ نے بتایا کہ یہ دونوں کام بالکل مختلف نوعیت کے ہیں اور ایک جماعت ان دونوں سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ۱۸۹۳ء میں ایک کیبنٹ کونسل (مجلس وزراء) قائم کی گئی جسے صرف عاملانہ اختیارات دیئے گئے اور قوانین کی تدوین کے لئے ایک علیحدہ مجلس وضع قوانین قائم کی گئی۔ ہر دو مجالس کے اختیارات و فرائض منصبی مرتبہ قواعد موسومہ بہ "قواعد قانونچہ" میں معین ہوئے نیز دوسرے انتظامی امور کے متعلق بھی "قانونچہ مبارک" کی توضیح کر دی گئی۔ یہی توضیح شدہ دستور حضرت جہاں پناہی کی تخت نشینی کے بعد یکم دسمبر ۱۹۱۴ء تک نافذ رہا جبکہ حضرت اقدس و اعلیٰ نے عارضی طور جیساکہ اوپر بیان کیا گیا، جملہ انتظامات کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لیا۔

حضرت جہاں پناہ نے ریاست حیدر آباد کی ہر جہتی ترقی کے مدنظر ۷ ار نومبر ۱۹۱۹ء جدید دستور اساسی کا نفاذ فرمایا اور ایک فرمان مبارک دربارہ تنظیم باب حکومت شرف صدور لایا جس کی روسے ایک ایگزیکیوٹیو کونسل (باب حکومت) قائم ہوئی جو آٹھ تجربہ کار ارکان اور رئیساے ملک پر مشتمل قرار دی گئی۔ ارکان باب حکومت کو جن کا ہر فرد صدر المہام کہلائے گا، وہی اختیارات دیئے گئے جو مدار المہامی میں معین المہاموں کو حاصل تھے۔ الا وہ اختیارات جن کی ترمیم ضمیمہ جات الف و ب و ج دستور العمل باب حکومت منسلکہ فرمان مبارک میں کردی گئی تھی۔ باب حکومت مقتدر اعلیٰ اور مختلف صیغہ جات حکومت کے درمیان ایک قدر مشترک یا اتصالی کڑی قرار دیا گیا۔ اس کے توسط سے نظم ونسق کے مختلف شعبوں میں باہمی تعاون و تعلق قائم کیا گیا اور ساتھ ہی اس کے ذریعہ سے منشائے شاہی کو حکومت کے انتظامات میں یکسانی اور سہولت سے شائع اور موثر کرنا ممکن ہوا۔ اس بنیادی انتظامی اصلاح سے حضرت جہاں پناہی نے ممالک محروسہ کی ترقی کی دوسری راہوں کو ہموار کردیا۔ فرمان مبارک ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے " مابدولت کا منشا اس فرمان کے اعلان سے یہ ہے کہ ان اختیارات و اقتدار منتقلہ کے فوائد سے جو ایک اچھی گورنمنٹ کی ضروریات کے موافق ہوں حتی الوسع اپنی عزیز رعایا کو بہرہ اندوز کیا جائے اور سرکاری ملازمین کی انتظامی ذمہ داریوں کے دائرہ کی توسیع اور ان کی نوعیت کی اصلاح کی جائے۔ مابدولت کے عہدہ داروں اور غیر عہدہ داروں کے مابین ارتباط کے زیادہ مواقع پیدا کئے جائیں تاکہ رعایا کی فلاح و بہبودی کے مشترکہ کام میں سہولت اور اس قدیم حکومت کی کامیابی و نیکنامی ہو۔ مابدولت اپنے تمام ملازمین کو بطور خاص متنبہ کرتے ہیں کہ

وہ اپنی مقررہ خدمات کی انجام دہی میں احساس فرائض وحب الوطنی اور غایت دلچسپی وانہماک سے کام لیں اور ہر فرد کو (خواہ عہدہ دار سرکار ہو یا نہ ہو) سمجھ لینا چاہیئے کہ ابدولت کی رعایا کے خوش و خرم رکھنے اور فارغ البال بنانے میں جہاں تک اسے موقع ہو حصہ لے" اس جدید دستور کو ابتدائی منزلیں طے کرانے میں سر علی امام مرحوم نے جس مخلصانہ سعی و کاوش کا ثبوت دیا اس کا یہاں اعتراف کرنا ضروری ہے

اس انتظامی اصلاح و درستی کے ماسوا عہد ہمایونی کا سب سے بڑا کارنامہ تعلیمی اصلاح ہے جس کی بدولت اہل دکن کی ترقی کا ولولہ ایک ایسے راستہ پر ڈالدیا گیا ہے جو انھیں صحیح منزل مقصود تک پہنچانے والا ثابت ہوگا۔ حضرت جہاں پناہی کی دوربین نظر اور فکر رسا نے یہ نکتہ پالیا کہ حیات اجتماعی کا دار و مدار علم و تعلیم پر ہے اسی کے ذریعہ زوال آمادہ اقوام کی رگوں میں زندگی کا نیا خون پیدا کیا جاسکتا ہے اور ان کے شل قوائے عمل کو پھر سے متحرک بنایا جاسکتا ہے۔ میکالے کے وقت سے جو تعلیمی نظام عمل ہندوستان میں رائج تھا اس کی بنیادیں کھوکھلی ہوچکی تھیں بعض اہل فکر نے یہ حقیقت محسوس کی کہ رائج الوقت تعلیم اجتماعی زندگی کے مقاصد کو پورا کرنے سے قاصر رہی اس لئے کہ اس نے ماضی اور حال میں رشتہ جوڑنے کے بجائے انھیں ایک دوسرے سے بالکل الگ کردیا جنگ عظیم کے بعد احساس خودداری کی جو لہر شمالی ہند میں پیدا ہوئی اس کے ارتعاشات دکن تک پہنچے۔ خود ذات شاہانہ نے یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ ماضی کی مستحکم بنیادوں پر حال اور مستقبل کی شاندار عمارت تعمیر کی جائے۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کی تاسیس کے موقع پر اس کی تصریح یوں فرمائی ہے:" اس جامعہ میں قدیم و جدید، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج

اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہو کر جسمانی و دماغی اور روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے۔"

جامعہ عثمانیہ میں اُردو زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بی۔اے تک لازمی رکھی گئی۔ چونکہ اُردو زبان میں سارے ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس کو فروغ دینے میں اب تک ہندوؤں اور مسلمانوں نے برابر کا حصہ لیا ہے، اس لئے حضرت جہاں پناہی نے اس زبان کی سرپرستی فرمائی۔ پھر اس کے علاوہ یہ زبان عرصے سے ممالک محروسہ کی سرکاری زبان رہی ہے اور عرصے سے اس میں انتظامی اور عدالتی اصطلاحات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہیں۔ اُردو کی سرپرستی سے حضرت جہاں پناہی نے ہندوستانی قومیت کی جڑوں کو مستحکم کر دیا۔ جب تک کسی قوم میں ایک معیاری زبان مشترک حیثیت نہ رکھتی ہو اس وقت تک وہ قوم صحیح معنی میں قوم نہیں کہلائی جا سکتی۔ زبان کا تہذیب و تمدن سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بغیر مشترک زبان کے ہندوستان کی مشترک تہذیب کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جو شاید کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو۔ اُردو کو محض مسلمانوں کی زبان سمجھنا بڑی تنگ نظری ہے۔ ان تمام قومی مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے جامعہ عثمانیہ میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا تاکہ ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں کے لئے ایک مثال قائم ہو جائے۔ بحمد اللہ کہ یہ تجربہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ فنون کی تعلیم میں تو ابتدا ہی سے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اُردو میں سائنس کی کتب نہ ہونے کے باعث تھوڑی بہت دشواری ہوئی لیکن تھوڑے ہی عرصے میں تراجم کے ذریعہ یہ دشواری بھی رفع ہو گئی۔ جامعہ عثمانیہ کا سررشتۂ تالیف و ترجمہ ۳۸۱

معیاری کتب کا ترجمہ شائع کر چکا ہے۔ جو مختلف علوم و فنون سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تراجم کی بدولت اعلیٰ التعلیم کی تقریباً تمام نصابی ضروریات پوری ہو چکی ہیں۔ لیکن ابھی بہت کچھ کام باقی ہے۔ مغربی علوم و فنون کو کسی مشرقی زبان میں منتقل کرنا ایسا کام نہیں جو چند سال میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ اس کے واسطے بہت عرصہ درکار ہے۔ لیکن وقت کا سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا اگر یہ یقین ہو کہ ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ درست ہے اور منزلِ مقصود کو پہنچانے والا ہے۔ اب رہا منزلِ مقصود پر پہنچنا تو اس کا انحصار ہمت کی بلندی اور حوصلہ کی وسعت پر ہے۔

احیائے علوم و فنون کا اثر جامعہ کی چار دیواری تک محدود نہیں رہا بلکہ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں کہ اہل دکن کی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا سراغ ملتا ہے۔ دراصل حیدرآباد کے عہدِ حاضر کی تمام بیداری اور ترقی کے باب میں جامعہ عثمانیہ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ ممکن ہے ہم نہ کر سکیں۔ شاید آئندہ نسلیں اس کا جائزہ بہ نسبت ہمارے زیادہ بہتر طور پر لے سکیں گی۔ پچھلے سولہ سترہ سال میں جامعہ عثمانیہ اہل دکن کا ایک قومی مرکز بن گیا ہے جو حیاتِ اجتماعی کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو جوڑتا اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ یہ ادارہ حیاتِ ذہنی کا مرکز ہونے کے ماسوا، دکن کی تہذیب و معاشرت کا امین ہے اور اس کی تمدنی بنیادوں کو مستحکم کرنے والا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس معنوی سرچشمہ کی آبیاری سے نہ صرف دکن بلکہ سارا ہندوستان مستفیض ہو رہا ہے۔

پچھلے پچیس سال میں اعلیٰ تعلیم کے علاوہ وسطانی اور تحتانی تعلیم پر بھی ممالکِ محروسہ میں کافی توجہ کی گئی۔ اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی کی تخت نشینی کے وقت مدارس کی تعداد

ایک ہزار کے قریب تھی جن میں ۶۵ ہزار طلبہ تعلیم پاتے تھے اور آج مدارس کی تعداد ۴½ ہزار ہے اور طلبہ کی تعداد ۲۲۳ لاکھ - ۲ ہزار ہے۔ اس وقت سررشتہ تعلیمات پر حکومت ۹½ لاکھ روپئے صرف کر رہی تھی، اور آج ایک کروڑ سے زائد خزانۂ عامرہ سے صرف ہو رہا ہے۔ تعلیم نسواں کی ترقی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ جس وقت حضرت جہاں پناہی تخت سلطنت پر جلوہ فروز ہوئے تو کل ممالک محروسہ میں ۸۰ تحتانی اور ۱۰ وسطانی مدارس تھے لیکن آج ۶۷۷ تحتانی اور ۲۸ وسطانی مدارس ہیں۔ یہ تعلیم المعلمات کے مدارس ہیں اور ان کے علاوہ دو نسوانی کالج بھی ہیں جہاں جامعی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔

کسی ملک کی تعلیمی سرگرمی سے آپ اس کی تمدنی ترقی کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ ذہن انسانی ہی وہ کسوٹی ہے جس پر اقوام کی ترقی کو پرکھا جا سکتا ہے اس میں بھلا کون شبہ کر سکتا ہے کہ ہندوستان کا آئندہ مورخ جب بیسویں صدی کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو عہد ہمایونی میں جامعہ عثمانیہ کے قیام کا ذکر محض ضمناً نہیں کرے گا بلکہ اُسے زیب عنوان بنائے گا اور اہل دکن کی نشاۃ جدیدہ کو اسی کی جانب منسوب کرے گا۔ یہ حیدرآباد کی خوش قسمتی تھی کہ جس وقت نشاۃ جدیدہ کی یہ داغ بیل ڈالی جا رہی تھی اُس وقت حضرت جہاں پناہی کو ایسے مخلص کام کرنے والے دستیاب ہو گئے جنھوں نے کام کی نوعیت کو سمجھا اور اس کی عظمت کو پہچانا۔ نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر فنانس ممبر سرکار عالی کو تعلیمی اصلاح و ترقی سے جو شغف رہا ہے اُس کا ذکر کرنا تحصیل حاصل ہے۔ موصوف نے نہ صرف ممالک محروسہ بلکہ سارے ہندوستان

کی آیندہ نسلوں پر جو احسان کیا ہے اُس کا اعتراف نہ کرنا دستور احسانمندی کے خلاف ہوگا۔ اسی طرح دوسرے صیغہ جات حکومت میں نشائے خسروی کو موثر بنانے والے ایسے قابل حکام موجود ہیں جو دنیا کی کسی حکومت کے لئے باعثِ فخر ہو سکتے ہیں۔

انتظامی اصلاح اور قیام جامعہ عثمانیہ کی بدولت جو ذہنی بیداری وجود میں آئی اس کا اثر زندگی اور حکومت کے ہر شعبہ میں نظر آرہا ہے، عدالت، صحت عامہ، صنعت و حرفت، زراعت، بلدیہ، آرائش بلدہ، پولیس، آثار قدیمہ، اور دوسرے محکموں میں پچھلے پچیس سال میں ترقی کی رفتار نہایت تیز رہی ہے۔ حکومت نے نظام ساگر پر رقم خطیر صرف کی تاکہ قرب و جوار کے ۲ لاکھ ستر ہزار ایکڑ زمین کو زیر کاشت لایا جاسکے۔ قدیم صنعتوں اور دستکاریوں کی سرپرستی کی جارہی ہے۔ ممالک محروسہ کی بعض صنعتیں جو تقریباً مٹ چکی تھیں انھیں پھر سے زندہ کیا گیا۔ اورنگ آباد کی کاغذسازی، مشرو، ہمرو اور جامیوار، ورنگل کی شطرنجیاں اور ململ اور بیدری ظروف کی صنعت کو اگر حکومت نے اپنی سرپرستی میں نہ لیا ہوتا تو عہد حاضر کے صنعتی مقابلے کی دستبرد سے ان کا محفوظ رہنا محال تھا۔ گزشتہ پچیس سال میں ممالک محروسہ میں ۳ ہزار میل سڑکیں اور ۱۳ سو میل ریل بنائی گئی تاکہ تجارت اور رسل و رسائل کی سہولتیں رعایا کے لئے مہیا ہوں۔ حکومت نے ایک کروڑ کا سرمایہ ملکی صنعتوں کو مدد دینے کی غرض سے علیحدہ کردیا ہے۔ اس کے علاوہ گرانی اجناس اور قحط کے مصائب سے کاشتکاروں کو محفوظ رکھنے کے لئے ۱/۲ ۲ کروڑ کا سرمایہ

مختص کر دیا گیا ہے تاکہ تقاویوں وغیرہ کے ذریعہ حاجتمند کاشتکاروں کی مدد کی جا سکے۔ یہ تمام اصلاحات اس لئے ممکن ہوئیں کہ حکومت کی مالیات اور ملک کی اقتصادی خوش حالی میں ایک خوشگوار تعلق قائم رہا۔ مالیات کی دنیا کا یہ ایک زبردست کارنامہ ہے کہ باوجود عالمگیر کساد بازاری کے ریاست حیدرآباد کا میزانیہ متوازن رہا اور آمدنی اخراجات سے کچھ زیادہ ہی رہی۔ حکومت کی مالیات کا یہ انصرام قابل داد ہے بغیر حکومت کی مالی پائداری کے تعمیر قومیت کے منصوبوں کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ رعایا پر محصول اور ٹیکس کا کوئی مزید بار نہیں ڈالا گیا۔ حکومت کی ساکھ اس وقت بہ نسبت ۲۵ سال قبل کے زیادہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہے۔ خزانۂ عامرہ کے موجودہ سرمایہ کی مقدار ۲۰ کروڑ کے لگ بھگ ہے جو مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ ذات شاہانہ کے دامن دولت تلے ملک کی اقتصادی خوش حالی میں جو اضافہ ہوا اور حکومتی مالیات کو جو استحکام نصیب ہوا ہے وہ ممالک محروسہ کی گزشتہ پچیس سال کی تاریخ کا ایک زریں ورق ہے۔

گزشتہ ربع صدی میں ممالک محروسہ کی خارجی حکمت عملی زیادہ تر مسئلہ استرداد برار سے متعلق رہی۔ جنگ عظیم کے بعد جبکہ برطانوی حکومت کو یکسوئی حاصل ہو چکی تھی، اعلیٰحضرت بندگان عالی نے ۲۵ ر اکتوبر سنہ ۲۳ء کو لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کے نام ایک مکتوب ارسال فرمایا جس میں مسئلہ برار کی دستوری نوعیت کو جو دستاویزی شہادتوں پر مبنی تھی، واضح فرمایا۔ دوران جنگ میں ریاست حیدرآباد نے برطانیہ کی جو امداد کی، اور اس کے علاوہ ویسے بھی

خاندان آصفجاہی نے حکومت برطانیہ کے ساتھ ہمیشہ جس دوستی اور اتحاد کا ثبوت دیا ہے اس کی بنا پر یہ توقع تھی کہ لارڈ موصوف استرداد برار کے مطالبے پر حق اور انصاف کے تحت غور کریں گے۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ بجائے اس کے حقوق مقتدرِ اعلیٰ کا دوسرا غیر متعلق مسئلہ چھیڑ دیا گیا۔ اگرچہ سر علی امام مرحوم نے اس مسئلہ کی تاریخی اور دستوری حیثیت کو گفت و شنید کے دوران میں بوضاحت پیش کیا لیکن حکومت ہند اپنے غیر منصفانہ نقطۂ نظر پر اڑی رہی۔ دس سال کا زمانہ گذر گیا اور بالآخر نومبر ۱۹۳۳ء میں ہزایکسلنسی لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند حیدرآباد تشریف لائے اور شاہی دعوت کے موقع پر مسئلہ برار کے متعلق اطمینان بخش اعلان فرمایا۔ یکم دسمبر ۱۹۳۳ء اس مسئلہ کے متعلق مندرجہ ذیل فرمان مبارک شرف صدور لایا۔ "ہزایکسلنسی وائسرائے بہادر کے میری ریاست سے روانہ ہو جانے سے قبل اور باعتراف اس اعلان کے جو انھوں نے اسٹیٹ بنکوٹ کے موقع پر فرمایا ہے میں ان جدید انتظامات کے متعلق اپنا اطمینان ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو سرکار عظمت مدار کے ساتھ حالیہ گفت و شنید کے نتیجے کے طور پر ہندوستان میں وفاقی دستور قائم ہونے پر میرے ملک برار کے آئندہ نظم و نسق کی نسبت عمل میں آئیں گے۔ میری رعایا کو ان تدابیر کے تفصیلی اعلان کا سخت انتظار رہے گا جن کی رو سے میرے ملک برار کا نظم و نسق اُس خطۂ ملک مِلکِ معظم کے ساتھ جو بنام ممالک متوسط موسوم ہے، بشمل ایک صوبۂ واحد کے ہوگا جس کا نام ممالک متوسط و برار رہے گا اور برار پر میری سلطنت عملاً اس طرح محیز ہوگی کہ اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہ رہیگی۔

برٹش گورنمنٹ اور میری گورنمنٹ دونوں کو اُمید ہے کہ ہندوستان کا دستوری نشوونما بزودی ممکنہ اعلان مذکور کی اجازت دے گا تاکہ ابواب طے شدہ سے مجھے جو اطمینان حاصل ہوا ہے اس میں میری رعایا بھی شریک ہو سکے۔"

ہندوستانی دستور اساسی کی تشکیل کی غرض سے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک لندن میں جو گول میز کانفرنسوں کے اجلاس منعقد ہوئے ان میں اور دوسری دیسی ریاستوں کی طرح حیدرآباد نے بھی شرکت کی۔ حضرت جہاں پناہی نے اپنے تجربہ کار وزیر نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کو ریاست کی نیابت کا حق تفویض فرمایا اور متعلقہ سیاسی امور کے متعلق جو حکومت سرکار عالی کا نقطہ نظر ہونا چاہیئے ان کی اصولی حیثیت سے رہنمائی فرمائی۔ حکومت سرکار عالی ایک ائل بہ ترقی حکومت ہے۔ وہ ہندوستانی سیاسی ارتقا کی راہ میں کبھی روڑا بننا پسند نہیں کرسکتی لیکن اس کے ساتھ ہی حضرت جہاں پناہی کے حقوق شاہانہ اور ممالک محروسہ کی داخلی آزادی کے حق کی حفاظت کرنا ضروری تھا تاکہ تعاون عمل کی شرائط ایک معین شکل اختیار کرلیں۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے اور بھی ہوکہ ہمیں واقعی اب تک نہیں معلوم کہ حکومتِ ہند کا سیاسی اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے برطانوی ہند میں کچھ عرصے سے عمومیت کا سیاسی تجربہ کیا جارہا ہے جس کا حشر کیا ہوگا، کوئی نہیں جانتا۔ وہاں انگریزی عملداری قائم ہونے کے بعد تمام قدیم ملکی سیاسی روایات کا خاتمہ ہوگیا اور زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار ہوا جس کو ماضی سے بہت کم تعلق تھا۔ برخلاف اس کے سلطنت آصفیہ ان تمام قدیم سیاسی روایات کی حامل ہے جو ماضی اور حال کے درمیان تسلسل قائم رکھتی ہیں۔ زندگی کے اور دوسرے

شعبوں کی طرح سیاست میں بھی ہمارا عہد حاضر ماضی کی مستحکم بنیادوں پر قائم ہے۔ حکومت خود اختیاری برطانوی ہند میں ایک دل خوش کن فریب نظر سے زیادہ وقیع نہیں۔ برخلاف اس کے بحمد اللہ ہمارے یہاں حکومت خود اختیاری ایک موثر حقیقت ہے۔ برطانوی ہند نے مغرب کے بہت سے اداروں کی اندھی تقلید میں اپنی حقیقی زندگی کے سرچشموں سے منہ موڑ کر مضحکہ خیز تعالی شروع کردی ہے جس کی ممالک محروسہ میں رہنے والوں کو چنداں ضرورت نہیں۔ مسلسل تاریخی روایات کے تحت ہمارے ہاں ایک مخصوص اور معیّن نظام زندگی وجود میں آچکا ہے جو ترقی اور اصلاح کا ضامن ہے اور اس کے ساتھ اس میں اتنا توسع ہے کہ ضروریات زمانہ کا ساتھ دے سکے۔ محض تعالی اجتماعی سیرت کے خدوخال کو مسخ کر ڈالتی ہے اور اس سے گروہوں کے مخصوص اوصاف تباہ ہو جاتے ہیں۔ ہماری سیاسی زندگی کی نہج ہماری قومی ضروریات کے لئے بالکل درست اور موزوں ہے۔ یہاں عمومیت کے نظر فریب مناظر پیش کرنا بے سود اور بے موقع ہے۔ خود مغربی ممالک میں جہاں عمومیت نے نشو و نما پائی، سیاسی رجحان کچھ اور ہے۔ غالباً تاریخ یورپ کے بعض محققوں کا یہ خیال مبالغہ پر مبنی نہیں کہ اہل مغرب کی سیاسی زندگی کی طویل اور دلچسپ داستان میں عمومیت محض ایک سرراہ ضمنی افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ مغربی ممالک میں سیاست نے جو نئی کروٹ لی ہے اس سے تو اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔

برطانوی ہند اور ممالک محروسہ کی سیاسی روایات کا مابہ الامتیاز ہمارے ہاں ذات شاہانہ کا وجود ہے۔ حیدرآباد والوں کو اپنی بادشاہ پرستی پر ناز ہے

اس لئے کہ حضرت اقدس و اعلیٰ کی ذات نہ صرف اختلافات سے بالاتر ہے بلکہ ملک کے سارے مرکز گریز عناصر کو یہی قوت ایک نقطۂ اتصال پر مجتمع کرنے والی ہے۔ دنیا میں کونسا سیاسی گروہ ہے جس میں لسانی یا مذہبی یا تمدنی اختلاف موجود نہ ہو ہمارے یہاں بھی اختلافات ہیں، ہمارے یہاں بھی گروہ بندیاں ہیں لیکن ذات شاہانہ ایک اتصالی کڑی ہے اور اس کے ساتھ وفاداری کا جذبہ اس قدر قوی اور شدید ہے کہ اس کے سامنے یہ سب اختلافات اسی طرح مٹ جاتے ہیں جیسے سورج نکلنے پر کہر۔ یہی جذبۂ وفاداری ہمارے سیاسی اداروں کی اساس ہے اور یہ ایسی مستحکم اساس ہے کہ اس کی بدولت ہمیں ان بہت سے تجربوں کی ضرورت باقی نہیں رہی جو برطانوی ہند میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ ہماری حکومت اپنے بنیادی اصول کو قائم رکھتے ہوئے حکومت ہند کی وفاقی تشکیل میں شرکت کے لئے تیار ہے اس لئے کہ وہ ہندوستان کے سیاسی ارتقا میں رکاوٹ پیدا کرنا نہیں چاہتی۔ لیکن اپنی ملکتی، انفرادیت کو قائم رکھنے اور حقوق شاہانہ کے تحفظ کے لئے ایسی شرائط کا دستاویز شرکت میں تعین کرنا ضروری ہوگا جن کی وجہ سے آئندہ کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ پچھلے چند سال کی سیاسی گفت و شنید نے برطانوی ہند پر یہ حقیقت آشکارا کردی ہے کہ ریاست حیدرآباد کیا بہ اعتبار اپنے رقبہ و آبادی اور کیا بہ اعتبار اپنے نظم و نسق اور سیاسی اہمیت کے ایک خاص حیثیت رکھتی ہے اور وفاق کی تشکیل جدید میں اس کی شرکت جس طرح خود اس کی مصالح کے لئے مفید ہے۔ اسی طرح برطانوی ہند کے لئے بھی ضروری ہے مملکتوں کا قیام و بقا زندگی کے بعض اٹل اصول پر مبنی ہوتا ہے جنھیں آپ

ناموس فطرت یا قانون الٰہی کہہ سکتے ہیں۔ اس مملکت کو دنیا میں کوئی نہیں مٹا سکتا جو اجتماعی زندگی میں عدل و مساوات کو فروغ دینے والی ہو اور جو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے مفاد عامہ کے نصب العین کو رکھتی ہو: بحمد اللہ کہ ہماری ریاست ابد مدت پچھلے دو سو سال سے اپنے فرائض منصبی سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہو رہی ہے۔ اس کے سایۂ عاطفت میں دکن میں ایک ایسا تمدن نشو و نما پا رہا ہے جو ہندوستان کی تعمیر قومیت کے لئے بمنزلہ ایک نمونہ ہے۔ خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ اس کے ماضی کی طرح اس کا مستقبل بھی شاندار ہوگا۔ ریاست ابد مدت کی ترقی کی ضمانت خود اس کے بادشاہوں کے اوصاف و اخلاق میں مضمر ہے۔

اس جگہ اورنگ زیب عالمگیر کے اُن الفاظ کا ذکر کرنا بے موقع نہ ہوگا جو اس نے اُس وقت کہے تھے جب اُسے یہ اطلاع ملی کہ غازی الدین خاں فیروز جنگ (نظام الملک آصفجاہ اوّل، بانی ریاست حیدرآباد کے والد) نے شہزادہ اعظم کو محاصرۂ بیجاپور کے موقع پر بروقت کمک پہنچائی اور اُسے دشمنوں کے نرغے سے بچا لیا۔ وہ دعائیہ الفاظ یہ ہیں: "چنانچہ حق سبحانہٗ تعالیٰ از تردد فیروز جنگ شرم اولاد تیموریہ نگاہ داشت آبروے اولاد او تا در قیامت خدا نگاہ دارد"[۱]

یوسف حسین خاں

---

[۱] منتخب اللباب، جلد ۲ صفحہ ۳۱۹

ضمیمہ

اس مضمون کی طباعت کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ہز مجسٹی ملک معظم اور اعلیٰ حضرت بندگان عالی کے مابین مسئلہ برار کے متعلق ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۶ء ایک معاہدہ پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے جس کی رُو سے علاقۂ برار پر اعلیٰ حضرت کے مالکانہ و شاہانہ حقوق علانیہ طور پر تسلیم کئے گئے ہیں۔ اس اقتدار اعلیٰ کا اعتراف معاہدہ کی مندرجہ ذیل دفعات میں صراحتاً کیا گیا ہے۔

(۱) برار میں جب کبھی اور جہاں کہیں گورنر صوبہ جات متوسط و برار کے احکام کی بنا پر برطانوی پرچم بلند کیا جائے گا اس کے پہلو بہ پہلو ہز اگزالٹیڈ ہائینس کا پرچم بھی بلند کیا جائیگا (۲) ہز اگزالٹیڈ ہائینس کا یہ حق تسلیم کیا جاتا ہے کہ حیدرآباد کے اعزازی خطابات باشندگان برار کو عطا فرمائیں بشرطیکہ ہز مجسٹی کے اس قایم مقام کا اتفاق قبل از قبل حاصل کیا جائے جو ریاستہائے ہند سے تاج برطانیہ کے تعلقات کے ضمن میں تاج کے اختیارات و فرائض انجام دینے کا مجاز ہو (۳) ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے اس حق کو ہز مجسٹی تسلیم فرماتے ہیں کہ وہ برار میں دربار منعقد فرمائیں بشرطیکہ ہر مرتبہ ہز مجسٹی کے قایم مقام مذکور کا اتفاق حاصل کیا جائے (۴) ہز اگزالٹیڈ ہائینس کو اختیار ہوگا کہ ہز مجسٹی کے قایم مقام مذکور کے اتفاق سے گورنر صوبہ جات متوسط و برار کو موزوں تقاریب میں رسمی شرکت کے لئے حیدرآباد آنے کی دعوت دیں (۵) برار کی کسی مسجد میں ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے نام سے خطبہ پڑھے جانے پر ہز مجسٹی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا (۶) باوجود اختتام معاہدہ مورخہ ۵ نومبر ۱۹۰۲ء ہز مجسٹی سالانہ رقم پچیس لاکھ روپیہ جو برار کی بابتہ اس وقت تک ادا ہوتی رہی ہے ہز اگزالٹیڈ ہائینس کو ادا فرماتے رہیں گے (۷) ہز اگزالٹیڈ ہائینس

کو یہ حق حاصل ہوگا کہ صوبہ جات متوسط و برار کے مستقر حکومت میں اپنا ایجنٹ بدیں اغراض رکھیں کہ وہ کسی ایسے معاملے سے متعلق اپنی حکومت کے خیالات کی نمایندگی کرے جو صوبہ جات متوسط و برار اور حیدرآباد دونوں کے مشترکہ اغراض پر مشتمل ہو یا حیدرآباد کے اغراض پر بلا واسطہ موثر ہو۔ لیکن بجز صورت مصرحہ بالا ایجنٹ مذکور کو صوبجات متوسط و برار کے کسی داخلی معاملے سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

متذکرہ بالا دفعات معاہدہ میں برار پر اعلیٰ حضرت بندگان عالی کا حق شاہی نہایت صراحت کے ساتھ تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن اس معاہدہ کی دوسری دفعات میں اس کی بھی صراحت کردی گئی ہے کہ صوبہ جات متوسط و برار کے نظم و نسق کی ذمہ داری گورنر صوبۂ مذکور پر عاید ہوگی جو بلا شرکت غیرے انتظامی اختیارات استعمال کرے گا۔

لارڈ ریڈنگ نے برار کے مسئلہ کو ایک امر منفصل قرار دے کر اس کے متعلق گفت و شنید کا دروازہ بند کردینا چاہا تھا لیکن جب سے وفاق ہندوستانی سیاست کا نصب العین بنا اس وقت سے حکومت ہند کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ برار کی آیندہ حیثیت کیا ہو۔ برار کو قانونی حیثیت سے کسی جدید سیاسی انتظام میں اس وقت تک شریک نہیں جا سکتا تھا جب تک کہ اس علاقے کے اصلی مالک کی رضامندی نہ حاصل کرلی جائے ورنہ آیندہ دستوری اور آئینی الجھنے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ باوجود لارڈ ریڈنگ کی ہٹ دھرمی کے حکومت ہند واقف تھی کہ برار میں اس کی حیثیت ایک کفیل اور ٹھیکہ دار سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ پہلی گول میز کانفرنس کے وقت سے حکومت ہند کی یہ خواہش تھی کہ برار کے متعلق کوئی سمجھوتے کی شکل پیدا ہو تا کہ برار کو ممالک متوسط کے ساتھ مثل ایک صوبہ واحد کے وفاق میں شریک کیا جاسکے۔ یہ موقعہ تھا کہ

ریاست حیدرآباد کے نمایندے اپنے من مانے مطالبات تسلیم کراتے اور بڑی حد تک انھوں نے اپنے مطالبات تسلیم کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ سیاست میں فیاضی اور مروت نام کو نہیں ہوتی۔ یہ دراصل مختلف گروہوں کے باہمی مفاد و اغراض کا کھیل ہے جو کبھی کشمکش کی صورت اختیار کرتا ہے اور کبھی صلح و تعاون کی میں اس جگہ یہ سوال چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا کہ متذکرہ بالا معاہدہ سے ریاست حیدرآباد کے مطالبات کس حد تک پورے ہوتے ہیں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اصل مطالبہ کے حصول کی جانب یہ ایک قدم ہے۔ اور اس کی اہمیت اسی میں مضمر ہے کہ اس سے صورت حالات میں ایک طرح کی جنبش پیدا ہوگئی ہے۔ اس ریاست ابد مدت کے ارباب حل و عقد کو یہ نصب العین اپنے سامنے رکھنا چاہیے کہ جس علاقے کا اقتدار اعلیٰ انھیں حاصل ہے اس کا نظم ونسق بھی کیوں نہ حاصل ہو خصوصًا اس وجہ سے کہ اس ریاست کا انتظامی معیار کسی اعتبار سے بھی برطانوی صوبوں سے نیچا نہیں اور اس میں ملحق ہونا اہل برار کے لئے حسن انتظام کی ضمانت ہوگا۔

اس تہ نامہ کے ساتھ وائسرائے بہادر نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ بہ اعتراف اقتدار اعلیٰ کے جو ہز اگزالٹیڈ ہائینس کو علاقہ برار پر حاصل ہے ان کا اور ان کے خاندانی جانشینوں کا خاندانی لقب آیندہ سے ہز اگزالٹیڈ ہائینس دی نظام آف حیدرآباد اینڈ برار ہوگا اور شہزادہ ولی عہد دولت آصفیہ کا لقب آیندہ سے ہز ہائنس دی پرنس آف برار قرار پائیگا۔ غرضکہ اس تہ نامہ میں برطانوی حکومت نے اعلیٰ حضرت بندگان عالی کے حق ملکیت و حق شاہی کو اس قدر صراحت کے ساتھ تسلیم کر لیا ہے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اب اس کا قطعی امکان پیدا ہوگیا ہے کہ ہندوستان کی سیاست کوئی نئی کروٹ بدلے اور

برطانوی حکومت کے مزید اغراض اس ریاست ابدمدت کے ساتھ وابستہ ہو جائیں اس وقت پھر یہاں کے ارباب حل و عقد کے لئے موقع ہوگا کہ اپنے جائز مطالبات کو مکمل طور پر تسلیم کرائیں اور یہ قدیم تصیفہ طلب مسئلہ عدل و انصاف کے اصول کے مطابق طے پائے لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ہوگا جب ہم خود بھی اپنے حوصلوں کو بلند اور اپنی نظر کو وسیع بنائیں جب تک ہمیں اپنے مقصد کو جائز اور قرین انصاف ہونے کا مکمل یقین نہ ہو اس وقت تک ہمارے قدم میدان عمل میں آگے نہیں بڑھ سکتے اور اگر بڑھیں گے تو ڈگمگاتے ہوئے جس گروہ میں قوت اور تنظیم ہوتی ہے وہ امور منفصل کو پھر سے طے کرانے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کے لئے قوت اور ہوشمندی دونوں درکار ہوں گی۔ اعلیٰ حضرت بندگان عالی نے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد سے جو پیہم جدوجہد ۱۹۰۲ء والے معاہدہ کو منسوخ کرانے کی کی اس سے دنیا واقف ہے اور اس کی نسبت یہاں ذکر کرنا بے سود ہے۔ ان مساعی جمیلہ کا ثمرہ اس وقت جدید معاہدہ کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہٗ کے سامنے جو نصب العین اس باب میں رہا ہے وہ اس قدر جائز اور قرین انصاف ہے کہ ایک نہ ایک دن اس کا پایۂ تکمیل کو پہنچنا یقینی ہے۔ جس دن پورا حق حقدار کو ملے گا اس دن نہ صرف دکن بلکہ سارا ہندوستان خوشی اور مسرت کے گیت گائے گا۔ خود برطانوی حکومت کی تاریخ کا یہ ایک روشن اور زرین باب ہوگا اس لئے کہ اس افسوسناک صورت حالات کا کلیتہً خاتمہ ہو جائے گا جس کے باعث ایک علاقے کے مقتدر اعلیٰ کو وہاں کے براہ راست نظم و نسق سے محروم کیا گیا ہے۔ غرضکہ جدید معاہدہ کامیابی کا پہلا قدم ہے جو حصول مقصد کی طرف اٹھایا گیا ہے اور اس واسطے رعایائے حیدرآباد و برار کے لئے اطمینان و مسرت کا موجب ہے۔

یوسف حسین خان

۴۸۶

قلمرو دکن کا تاریخی جغرافیہ

جغرافیہ کی اہمیت۔ ہندوستان کا محل وقوع۔ دکن اور اس کے طبعی حدود۔ پہاڑ۔ اس سلسلے کے ذیلی حصے۔ دریا۔ تالاب اور مصنوعی جھیلیں۔ آب و ہوا۔ دھاتیں صنعتیں۔ اسباب حمل و نقل۔ ریلیں اور تاریخی مقامات۔ تمدنوں کا سنگم۔ نسلیں اور زبانیں۔ مذہب۔ دکن کے تاریخی حدود۔ قلمرو آصفی کی موجودہ سیاسی تقسیم

جغرافیہ کی اہمیت کسی ملک کی تاریخ کے حقیقی معنی سمجھنے کے لئے اور اُن اثرات کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے جو گھٹتے بڑھتے حدود ملکی کے برخلاف مستقل اور قائم ہوتے ہیں، اس کی ضرورت ہے کہ اس ملک کی جغرافی حالات پر غائر نظر ڈالی جائے[1]۔ اس میں شبہ نہیں کہ حال میں بعض براعظموں مثلاً امریکہ و آسٹریلیا میں ایسے حدود قائم کر دیے گئے ہیں جو محض عرض البلد اور طول البلد کا اتباع کرتے ہیں لیکن ایسے حدود دراصل مستثنیات سے ہیں اور یا تو ایک ہی ملک کے مختلف اجزا کے درمیان ہیں ورنہ ایسے ممالک کے درمیان ہیں جن میں اب جنگ ہونا بعید از قیاس ہے، جیسے ممالک متحدہ امریکہ و کناڈا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے مصنوعی حدود جنگ کا آغاز ہوتے ہی بیکار ہو جاتے ہیں، اور ایسی صورت حال میں اگر کوئی حدود کام دے سکتے ہیں تو وہ اصلی یعنی جغرافی حدود ہیں۔ آجکل بھی باوجود سرعت رفتار و پرواز کے یہ بڑے بڑے دریا، پہاڑ اور سمندر ہی ہیں جو کسی ملک کو ایک

---

[1] بغیر جغرافی معلومات کے تاریخ سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ جورج "تاریخ اور جغرافیہ کا تعلق" George: Relations of Geography and History. آکسفورڈ سنہ ۱۹۱۰ء باب ۱۱

بڑی حد تک دشمنوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ یہ ایک طرح پر کسی گھر کی دیواروں کے مانند ہیں جس کے ہوتے ہوئے گھر والے نہایت آرام و آسایش سے اپنی زندگی بسر کرتے ہوں، اور اگر کہیں وہ دیواریں ٹوٹ جائیں یا توڑ دی جائیں تو یہ لوگ بے غیر محفوظ ہو جائینگے۔ اسی طرح جنگ کے زمانہ میں بھرے ہوئے دریا اور اونچے اونچے پہاڑ جس فریق کے قبضہ میں ہوں گے اس فریق کو اپنے دشمن پر ایک طرح کا تفوق حاصل ہوگا، چنانچہ طاقتور اقوام ہمیشہ اس امر کی کوشش کرتی ہیں کہ ایسے دریا اور پہاڑ دشمن کے قبضہ میں نہ جانے پائیں۔

جغرافی کیفیات کا جو اثر آبادی کے طبایع پر ہوتا ہے وہ بھی عیاں ہے۔ پہاڑی لوگ میدان والوں سے زیادہ تنومند ہوتے ہیں اور سرد ملک والوں کو گرم ملک والوں سے کہیں زیادہ جفاکشی کا عادی بننا پڑتا ہے۔ پھر ساحل پر رہنے والوں کے عادات و خصلات اندرون ملک والوں سے کہیں مختلف ہوتے ہیں۔ حضری بدویوں سے ممتاز ہوتے ہیں اور بڑے ملک والوں کا زاویہ نگاہ چھوٹے ملک والوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے اگر کوئی شخص ناف شہر میں رہتا ہو تو اس کے خیالات یقیناً اُس شخص کے خیالات سے ممتاز ہوں گے جو مضافات میں قیام پذیر ہو۔ سیاسی اور فوجی تاریخ (جس پر بیشتر سیاسی تاریخ مبنی ہے) ایک بڑی حد تک جغرافیہ پر منحصر ہوتی ہے، اس لئے کہ بڑے سے بڑے فاتح کو بھی حتی الامکان پہاڑوں اور دریاؤں سے گریز کرنا پڑتا ہے اور اگر ان سے چارہ کار ہی نہ ہو تو ایک مدبر فاتح آسان گذاروں یا دریاؤں کے ایسے حصوں کو انتخاب کرتا ہے جن پر آسانی سے

سلہ مقابلہ کرو مقدمہ ابن خلدون حصہ اول لاہور ۱۹۰۹ء۔

آمد و رفت ممکن ہو۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ جس راستہ سے ملک کافور، محمد تغلق، شاہ جہاں اور حضرت آصفجاہ اول دہلی سے دکن آئے وہ تقریباً وہی ہے جو گریٹ انڈین پنینن سولا ریلوے نے اختیار کیا ہے، اور اسی طرح اگر آج آپ ریل میں پیرس سے ہوسکو جائیں تو تقریباً اُسی راستہ پر ہو کر گزریں گے جو نیولین اعظم نے اپنی روسی مہم سر کرنے کے وقت اختیار کیا تھا۔

ہندوستان کا محل وقوع! ایشیا کے نقشہ میں شاید سب سے پہلے اس عظیم الشان جزیرہ نما پر نظر پڑے گی جو اس کے جنوب کی طرف عین وسط میں آویزے کی طرح لٹکا ہوا ہے اور جسے باقی ماندہ براعظم ایشیا سے دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہمالیہ پربت جدا کرتا ہے۔ ملک ہند کے جغرافی امتیاز میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے، اس لئے کہ خواہ اس کے اندر لسانی، مذہبی، تاریخی، کیا ہی تنوع کیوں نہ پایا جائے، کم از کم جغرافی اعتبار سے اس ملک میں ایک طرح کی وحدت کا پرتو نظر آتا ہے جس سے دوسرے ممالک محروم ہیں۔ نہ صرف شمال میں ہمالیہ اس کی قدرتی دیوار بنا ہوا ہے بلکہ مشرق میں آسام اور برہما کے پہاڑ، مغرب میں کوہ سلیمان، جنوب و مشرق میں خلیج بنگالہ اور جنوب و مغرب میں بحیرہ عرب واقع ہیں۔ اس کے علاوہ مشرقی اور مغربی گھاٹ بھی اپنی اپنی جگہ اس ملک کے استحکام کو دوبالا کرتے ہیں۔ نیز برخلاف اُن ممالک کے جو ہندوستان کے شمال میں واقع ہیں یہ ملک ایک عظیم الشان میدان سے شروع ہوتا ہے جو کوہ سلیمان سے آسام اور برہما کی پہاڑیوں تک اور دامن ہمالیہ سے عین وسط ملک یعنی بندھیاچل کے محاذ تک پھیلا ہوا ہے اور جو دو ہزار میل سے زیادہ طویل اور کہیں کہیں ایک ہزار میل کے قریب عریض ہے۔

کوہ بندھیاچل ملک ہندوستان کے عین وسط میں واقع ہے، اور گو بیچ میں دشوار گذار ہے لیکن اس کے مشرق اور مغرب دونوں طرف بحری ساحل کے قریب

ایسے کھلے ہوئے راستے یعنی مشرق اوڑلیسہ اور بنگالہ مغرب میں کاٹھیاواڑ اور خاندیش کے میدان موجود ہیں کہ یہاں ہو کر شمال والا جنوب کو اور جنوب والا شمال کو آسانی سے جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی اِسی پہاڑ کے متوازی دو دریا نربدا اور تاپتی ایسے بہتے ہیں جو ایک اعتبار سے تمام جزیرہ نمائے ہند میں لاثانی ہیں۔ ہندوستان کے باقی ماندہ دریا یا تو مشرق کی طرف بہتے ہیں جیسے خلیج بنگالہ میں گرنے والے دریا، گنگا، کرشنا، کاویری وغیرہ ورنہ جنوب کی طرف، جیسے برہم پترا اور دریائے سندھ معہ اپنے معاونوں کے؛ لیکن یہ دو دریا جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں باقی تمام دریاؤں کے برخلاف عین مغرب کی طرف بہہ کر بحیرہ عرب میں جا گرتے ہیں۔ ان پہاڑوں اور دریاؤں سے ہندوستان کے دو طبعی ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک کو ہم شمالی میدان اور دوسرے کو دکھنی سطح مرتفع کہہ سکتے ہیں۔

دکن اور اُس کے طبعی حدود | جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے جنوبی ہندوستان کے دونوں ساحلوں کے تقریبًا متوازی کم و بیش اونچے پہاڑ واقع ہیں جنھیں مشرقی اور مغربی گھاٹ کہتے ہیں۔ ان میں سے مغربی گھاٹ جو مغربی ساحل سے بالکل قریب ہے، اوسطًا (۴۰۰۰) فٹ بلند ہے؛ یہی وہ سلسلہ ہے جس کی چوٹیاں پہلے راشٹر کوٹوں، پھر چالوکیوں اور حال کے زمانے میں مرہٹوں کی آماجگاہیں بنیں اور جن کے ذریعہ سے ساحلی علاقہ باہر والوں کی دست برد سے محفوظ رہ سکا۔ مغربی گھاٹ میسور کے جنوب میں نیلگری پہاڑ تک، جسکی ایک چوٹی ساڑھے آٹھ ہزار فٹ بلند ہے برابر چلا جاتا ہے؛ وہاں سے شمال ؤ مشرق کی طرف مشرقی گھاٹ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے لیکن اس کے قلّے اس قدر اونچے نہیں جتنے مغربی گھاٹ کے ہیں؛ اور ساتھ ہی مغربی گھاٹ کے برخلاف متعدد دریا

اس سلسلے کو کاٹ کر سمندر کی طرف نکل جاتے ہیں۔ ان دونوں زنجیروں کے وسط میں جنوبی ہند کے عین مرکز کے قریب ایک سطح مرتفع نظر آئے گی جو مغربی گھاٹ سے برابر مشرقی گھاٹ کی طرف جھکتی چلی گئی ہے اور جو سطح سمندر سے اوسطاً (۱۲۵۰) فٹ بلند ہے یہی وہ حصہ ہے جسے آجکل عرف عام میں دکن کہتے ہیں اور جس کے بیشتر حصہ پر ہمارے بادشاہ ذیجاہ اعلیحضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی حکومت ہے۔

لفظ "دکن" سنسکرت لفظ "دکشن" سے مشتق ہے جس کے معنی سیدھے ہاتھ کے ہیں اور اس سے مراد دراصل اس سمت سے تھی جو شمال و مغرب کی طرف سے آریوں کے ہندوستان میں داخل ہوتے وقت ان کے سیدھے ہاتھ پر پڑتی تھی۔ چونکہ یہ سمت جنوبی سمت تھی اس لئے رفتہ رفتہ اس لفظ "دکشن" کے معنی "جنوب" کے ہوگئے اور "دکھن" یا "دکن" سے مراد جنوب سے لی جانے لگی۔ لیکن عرف عام میں آجکل جس حصے کو دکن کہتے ہیں اس سے مراد تمام جنوبی ہند نہیں بلکہ زیادہ تر وہ حصہ ہے جو بندھیاچل اور نربدا یا کم سے کم تاپتی کے جنوب سے دریا تنگ بھدرا تک اور مغربی گھاٹ سے مشرقی گھاٹ تک واقع ہے۔ اس کے دو بڑے ممتاز حصے ہیں ایک تو پہاڑی یا مہاراشٹری دکن جس کا مرکز پونہ ہے، اور دوسرے جنوبی دکن یعنی قلمرو حضور نظام، جس کا سیاسی مرکز حیدرآباد ہے۔ دریائے تنگ بھدرا سے راس کماری تک کا ملک دکن سے باہر "جنوبی ہند" میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مضمون کا موضوع زیادہ تر قلمرو حضور نظام خلد اللہ ملکہ ہے

سلہ انسٹیڈ ٹیلر، عام اور ملکی جغرافیہ Unstead and Taylor: General and Regional Geography. لندن ۱۹۱۱ء باب ۲۴

سلہ مہابھارت، سبھا پروان، ۳۱، ۱۷، ایس پانڈیوں کے ملک کو "دکن" سے باہر بتایا گیا ہے۔ دیکھو بھنڈارکر "قدیم تاریخ دکن" کلکتہ ۱۹۲۸ء فصل ۱ R. G. Bhandarkar: Early History

گو بعض دوسرے حصہ جات ملک ہند ایسے ہیں جن کا اس خطے سے قدرتی یا تاریخی لگاؤ ہے، جیسے برہان پور و خاندیش، بیجاپور، مہاراشٹر، برار وغیرہ جن کی تاریخ خطۂ دکن کی تاریخ کا جزو لاینفک سمجھنا چاہئے۔ اسی لئے قلمرو سرکار نظام کے ساتھ ساتھ ان خطوں کی تاریخ کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔

"قلمرو سرکار عالی" جسے "ریاست حیدرآباد" بھی کہتے ہیں جنوبی ہند کے بالکل وسط میں یعنی شمالی عرض البلد ۱۰' -۱۵° و ۴۱' ۲۱° اور مشرقی طول البلد ۳۵' -۸۱° و ۴۰'-۷۴° کے درمیان واقع ہے۔ علاقہ برار کو جو اسی ریاست ابد مدت کا ایک جزو ہے اور جو انتظامی اغراض سے سرکار انگریزی کے سپرد کردیا گیا ہے، جدا سمجھنے کے بعد بھی اس کا زیادہ سے زیادہ طول ۴۷۵ میل اور زیادہ سے زیادہ عرض ۴۸۳ میل نظر آئے گا۔ اس کا رقبہ ۸۲،۶۹۸ مربع میل ہے یعنی یہ انگلستان اور اسکاچستان کے متحدہ رقبہ (۸۱،۲۷۹ مربع میل) سے بقدر سوا ہزار مربع میل کے بڑا ہے۔ اس کے شمال میں ضلع مشرقی خاندیش (احاطہ بمبئی) اضلاع چاندا و وردھا (ممالک متوسط) اور علاقہ برار، مشرق میں ضلع چاندا، ریاست بستار اور ضلع مچھلی بندر (احاطہ مدراس) جنوب میں اضلاع کرشنا، گنٹور، کرنول و بلاری (احاطہ مدراس)، اور مغرب میں اضلاع ناسک، احمدنگر، شولاپور، بیجاپور، دھارواڑ (احاطہ بمبئی) واقع ہیں۔ اس سے یہ مراد نہ لینی چاہئے کہ ان حدود کے اندر جو علاقہ ہے وہ سب کا سب ممالک محروسہ میں شامل ہے، اس لئے کہ ایک طرف تو ضلع مچھلی بندر (علاقہ مدراس) اور اضلاع بیجاپور، شولاپور، اور احمدنگر (علاقہ بمبئی) کے حدود کے اندر متعدد مواضعات سرکار عالی کی ملک ہیں، دوسری جانب سرکار عالی

The Imperial Gazetteer of   ۵؎ امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد ۱۳

کے اضلاع نلگنڈہ، رائچور، عثمان آباد، بیڑ اورنگ آباد کے بعض دیہات پر سرکار انگریزی کا دور اورنگ آباد کے ایک قطعہ جے سنگھ پورہ، پر مہاراجہ جے پور کا قبضہ ہے۔ خود علاقہ براڑ جو ... رو پیہ کلدار کے معاوضہ میں سرکار عالی نے سرکار انگریزی کے سپرد کردیا ہے، سوئیزرلستان سے بقدر ڈیڑھ ہزار مربع میل بڑا ہے۔ اس علاقہ کا رقبہ ۱۷،۷۱۰ مربع میل ہے۔ اور یہ شمالی عرض البلد ۱۲-۴ و ۳-۲۱ اور مشرقی طول البلد ۵-۵۹، و ۱۱-۷۹ کے درمیان واقع ہے۔[۲]

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ جو دریا باقی ماندہ ممالک محروسہ کو سیراب کرتے ہیں وہی براڑ میں ہو کر گذرتے ہیں اور اسی طرح حیدرآباد اور براڑ کے پہاڑ بھی ایک ہی سلسلے میں منسلک ہیں، یعنی ممالک محروسہ کی طرح پورنا، وردھا اور پائیں گنگا ملک براڑ کو بھی سیراب کرتے ہیں، اور ملک براڑ حیدرآباد کی گاول گڑھ کے سلسلے اور اجنتہ بالاگھاٹ کے زنجیروں کے درمیان واقع ہے۔ ان امور سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم جغرافی اعتبار سے براڑ ممالک محروسہ سرکار عالی کا ایک قدرتی ٹکڑا ہے۔

پہاڑ جیسا اوپر لکھا جاچکا ہے ممالک محروسہ سرکار عالی کا بیشتر حصہ ایک سطح مرتفع ہے جس کا ڈھال شمال و مغرب سے جنوب و مشرق کی طرف کو ہے۔ یہ سرزمین سمندر کی سطح سے اوسطاً ۱۲۵۰ فٹ بلند ہے اور مشرقی میدان کو نظر انداز کردیا جائے تو سطح مرتفع کی بلندی ۱۲۰۰ فٹ سے لے کر ۲۵۰۰ فٹ تک پہونچتی ہے۔ یوں تو پوری سطح مرتفع ایک بڑی حد تک ناہموار ہے، لیکن اس میں جگہ جگہ پہاڑ اور کوہی زنجیرے بھی واقع ہیں۔ زنجیرہ بالاگھاٹ ضلع نظام آباد سے شروع ہوتا ہے اور ناندیر دیالم ہوتا ہوا

---

[۲] امپیریل گزیٹیر آف انڈیا جلد ۱۳، صفحہ ۲۲ The Imperial Gazetteer of India

تقریباً ۲۰ میل کے بعد تعلقہ اشٹی ضلع بیڑ میں جا کر ختم ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک شاخ کی ابتدا ممالک محروسہ میں دریا رانجرا اور گنگا کے درمیان سے ہوتی ہے، اور آشٹی ہوکر نلدرگ ہوتی ہوئی گلبرگہ پہونچ جاتی ہے شمال میں زنجیرہ سہادری پربت، نرمل ضلع نظام آباد سے نکل کر ضلع پربھنی و علاقہ برار میں گذرتا ہوا اجنتہ پہونچ کر اجنتہ گھاٹ کہلاتا ہے اور اس حصے کو عبور کرکے خاندیش میں مغربی گھاٹ سے مل جاتا ہے۔ ان کوہی سلسلوں کے علاوہ مختلف حصص ملک میں نسبتہً نیچی پہاڑیوں کے زنجیرے نظر آتے ہیں، جیسے کوملکنڈہ سے بیدر اور قندھار تک، چیاپور سے میدک تک، پرتور سے احمد نگر (احاطہ بمبئی) تک، بیدر سے ہنماباد تک، ضلع ورنگل سے ضلع عادل آباد تک، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تمام ملک پہاڑیوں اور ٹیلوں سے بھرا پڑا ہے۔[ا]

اس خطے کے قدرتی حصے | ان پہاڑیوں کے پتھر زیادہ تر دو قسموں کے سمجھنے چاہئیں، ایک تو آتش فشاں پہاڑ جن کے پتھر بھورے رنگ کے ہوتے ہیں اور جو زیادہ تو مغربی حصے میں پائے جاتے ہیں، اور دوسرا چنیا پتھر اور آتشیں پتھر کا علاقہ جو زیادہ تر مشرقی حصے پر مشتمل ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہ دو طبعی حصے ممالک محروسہ کے دو مختلف تمدنوں کا بھی گہوارہ رہے ہیں، اس لئے کہ پہلے حصے میں مرہٹے اور کنڑے پھیلے ہوئے ہیں۔ اور دوسرے حصہ میں آندھرا قوم آباد ہے۔ چنانچہ پہلے حصے کو مرہٹواڑی اور دوسرے کو تلنگانہ کا نام دیا جاتا ہے۔ تلنگانہ کی پہاڑیاں اپنی نوع کی لاثانی پہاڑیاں ہیں اس لئے کہ انہیں کوئی دیکھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے جدا جدا پتھروں کو ایک

[ا] بلگرامی و ولمٹ: تاریخی و بیانیہ خاکہ قلمرو نظام جلد ا و بمبئی ۱۸۸۳ء

Bilgrami & Wilmott: Historical and Descriptive

دوسرے پر چڑھ دیا ہے اور بعض مرتبہ تو کسی چھوٹے سے پتھر پر ایک عظیم الجثہ تودا ٹلا ہوا نظر آتا ہے۔ اس قسم کے مناظر کی اصلی وجہ یہ ہے کہ امتدادِ زمانہ سے سخت پتھروں کے درمیان نرم پتھر کا جو حصہ تھا وہ گھس گیا ہے اور سخت پتھر جو پہلے ایک دوسرے کے ساتھ اس نرم پتھر کی وجہ سے پیوست تھے اب علیحدہ ہو گئے ہیں۔ مرہٹواڑی اور تلنگانے کے طبعی خصائص بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ چونکہ مغربی یا مرہٹواڑی حصہ میں سطح مرتفع میں واقع ہوا ہے، اس لئے وہ نسبتاً ہموار ہے۔ لیکن تلنگانے کے علاقہ میں جگہ جگہ منفرد پہاڑیاں اور ٹیلے ملتے ہیں۔ مرہٹواڑی اور تلنگانے کی آراضی میں بہت بڑا فرق ہے۔ شمالی مرہٹواڑی کی اراضی اس قسم کی ہے جسے عرف عام میں کالی مٹی کہتے ہیں اور جو عموماً نہایت زرخیز اور خاص طور پر کپاس کی کاشت کے لئے موزوں ہے۔ اس کے برعکس مشرقی حصے یعنی تلنگانے کی زمین ریتلی ہے اور اس میں پانی جذب ہو کر نیچے چلا جاتا ہے۔ یہاں کی زمین کے ڈھلاؤ اور پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے اس میں نہریں نہیں بنائی جا سکتیں، چنانچہ یہاں کے دریاؤں پر بند باندھ کر اور اس طرح پانی کو تالابوں میں جمع کر کے اُن سے آبپاشی کی جاتی ہے۔ یہ حصہ زیادہ تر چاول اور نیشکر کی کاشت کے لئے موزوں ہے۔ اگر جنوب میں دریائے تنگ بھدرا اور دریائے کرشنا کے سنگم سے دریائے مانجرا اور دریائے گوداوری کے سنگم تک ایک خط کھینچا جائے اور اُسے شمال میں برار تک بڑھا دیا جائے تو یہ خط ان دونوں حصوں یعنی مرہٹواڑی اور تلنگانے کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیگا۔ ؎

دریا | علاوہ دریائے تاپتی کے جو برار کی شمالی حد قائم کرتا ہے، باقی دریاؤں کا بہاؤ

؎ دیکھو مردم شماری ہندوستان ۱۹۳۱ء جلد ۲۳، حصہ ۱

علی العموم مغرب سے مشرق کی طرف کو ہے۔ دکن کا سب سے بڑا دریا گوداوری ہے جو مغربی گھاٹ سے نکل کر پھلیبا کے مقام پر ممالک محروسہ میں داخل ہوجاتا ہے اور ضلع اورنگ آباد کی جنوبی سرحد قائم کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ دریا اضلاع اورنگ آباد۔ بیڑ، پربھنی، ناندیڑ، نظام آباد، عادل آباد، کریم نگر، اور ورنگل کو سیراب کرتا ہوا ضلع مچھلی بندر (علاقہ مدراس) میں نکل جاتا ہے۔ ممالک محروسہ کے اندر اس کے ساڑھے چھ سو میل کے راستہ میں بہت سی ندیاں اس سے آکر ملتی ہیں جن میں سے اہم ترین شمالی ندیاں دودنا، پورنا، پائیں گنگا، وردھا اور پرنہتا، اور جنوبی ندیاں مانجرا اور مانیر ہیں۔ گوداوری سے نہ صرف ضلع اورنگ آباد و ضلع احمد نگر (احاطہ بمبئی) کی حد قائم ہوتی ہے، بلکہ آگے چل کر وہ اورنگ آباد اور پربھنی کو بیڑ سے ناندیڑ اور عادل آباد کو نظام آباد اور کریم نگر سے، اور خود کریم نگر اور ورنگل کو ریاست بستار اور ضلع مچھلی بندر (احاطہ مدراس) سے بھی جدا کرتا ہے۔ گوداوری کے متعدد معاونوں میں دریائے پورنا کنٹر ضلع اورنگ آباد سے نکل کر ۱۴۵ میل کے بعد ضلع پربھنی میں گوداوری سے مل جاتا ہے۔ اسی طرح پائیں گنگا علاقہ برار میں برآمد ہوتا ہے اور پربھنی، ناندیڑ اور عادل آباد کو برار اور ممالک متوسط سے جدا کرتا ہوا چنور، ضلع عادل آباد پر آکر گوداوری میں گرجاتا ہے۔ دریائے مانجرا ضلع بیڑ میں نکل کر اس ضلع کو عثمان آباد سے جدا کرتا ہوا بیدر و میدک سے گذرتا ہے، اور نظام آباد کو ناندیڑ سے جدا کرتا ہوا ۳۰۰ میل سفر کرنے کے بعد ان دونوں اضلاع کی سرحد پر گوداوری سے جا ملتا ہے۔ گوداوری کے معاونوں میں آخری قابل ذکر دریا مانیر ہے۔ جو ضلع کریم نگر میں نکل کر پائیں گنگا کے سنگم سے ذرا اوپر گوداوری میں گرجاتا ہے۔ ممالک محروسہ

سرکار عالی کا دوسرا عظیم الشان دریا کرشنا ہے جو مہابلیشور (احاطہ بمبئی) سے نکلتا ہے اور ممالک محروسہ میں گلبرگہ اور رائچور کی سرحد پر ہو کر گلبرگہ اور محبوب نگر کو رائچور سے جدا کرتا ہوا محبوب نگر اور نلگنڈہ کی حد فاصل بن جاتا ہے اور ممالک محروسہ کو اضلاع ملحقہ[9] یعنی بلاری۔ کرنول۔ اور گنٹور سے جدا کرتا ہوا ورنگل نلگنڈہ اور گنٹور والے سرحدہ کے قریب ممالک محروسہ کی سرحد سے چھوڑ کر مچھلی بندر (احاطہ مدراس) کے محاذ میں تقریباً ۸۰ میل کے سفر کے بعد خلیج بنگالہ میں گر جاتا ہے۔ گوداوری کی طرح کرشنا کے بھی متعدد معاون ہیں جن میں سے بھیما، تنگ بھدرا، موسی اور منیر نسبتہً زیادہ اہم ہیں۔

دریائے بھیما پونہ کے قریب مغربی گھاٹ سے برآمد ہو کر ضلع گلبرگہ میں داخل ہوتا ہے اور اضلاع محبوب نگر رائچور اور گلبرگہ کے سرحدہ کے قریب کرشنا میں مل جاتا ہے۔

تنگ بھدرا علاوہ رائچور کی مشرقی سرحد کے ممالک محروسہ میں واقعاً داخل نہیں ہوتا، بلکہ تقریباً دو سو میل تک اس کی اور احاطہ مدراس کی حد فاصل قائم کرتا ہوا اضلاع محبوب نگر، رائچور اور ضلع کرنول (احاطہ مدراس) کے سرحدہ پر کرشنا سے مل جاتا ہے۔

موسی ندی، جس پر ممالک محروسہ کا پایہ تخت حیدرآباد "فرخندہ بنیاد" آباد[10] ہے، ضلع اطراف بلدہ کے مغرب میں نکل کر تھوڑی دور شمال و مغرب کی طرف چلتی ہے، وہاں سے تقریباً عین مشرق کی طرف عثمان ساگر (گنڈی پیٹ) اور حیدرآباد ہوتی ہوئی ضلع نلگنڈہ

---

[9] ان اضلاع کو اضلاع ملحقہ اس لئے کہتے ہیں کہ گو ۱۷۹۲ء اور ۱۷۹۹ء میں انھیں قلمرو حیدرآباد تفویض کر دیا گیا تھا لیکن اکتوبر ۱۸۰۰ء میں انھیں فوجی مصارف کی پابجائی کے لیے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا اور اب یہ احاطہ مدراس کا ایک جزو ہیں۔

[10] یہ شہر ۷۸-۲۸ شمالی طول البلد اور ۱۷-۲۲ مشرقی عرض البلد پر واقع ہے۔

میں داخل ہوکر جنوب کا رُخ کر لیتی ہے اور ۱۴۴ میل چل کر ضلع گنٹور (احاطۂ مدراس) کی سرحد پر کرشنا میں جا گرتی ہے۔ منیر، پاکھال جھیل ضلع ورنگل سے نکل کر اسی ضلع میں بہتی ہوئی ضلع مچھلی بندر (احاطہ مدراس) میں دریائے کرشنا میں مل جاتی ہے۔

تالاب اور مصنوعی جھیلیں

یوں تو ممالک محروسہ میں پچاس سے زیادہ چھوٹے بڑے دریا اور ندیاں ہیں مگر سب سے ممتاز یہی ہیں جن کا اوپر بیان کیا گیا۔ یہ سب دریا موسم باراں میں خوب بھرے چلتے ہیں، لیکن گرمیوں میں چھوٹی ندیاں تقریباً خشک ہو جاتی ہیں اور صرف بڑی ندیوں اور دریاؤں میں خصوصاً ان میں، جو مغربی گھاٹ میں نکلتے ہیں، پانی کا بہاؤ رہتا ہے۔ لیکن جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے۔ مشرقی حصے یعنی تلنگانے میں زمین کا ڈھلاؤ زیادہ ہونے کے باعث یہاں دریا نہایت تیزی سے بہتے ہیں؛ دوسرے یہاں کی مٹی ریتلی ہے جس کی وجہ سے پانی جذب ہو جاتا ہے، انھی اسباب کی بنا پر یہاں آبپاشی بڑے بڑے تالابوں اور مصنوعی جھیلوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے جو چھوٹے چھوٹے دریاؤں کے بہاؤ پر پشتے باندھ کر بنائی جاتی ہیں، اور ان تالابوں اور جھیلوں سے چھوٹی چھوٹی نہریں نکال کر ان سے مزروعہ اراضی میں پانی دیا جاتا ہے۔ یوں تو تلنگانے کے تقریباً ہر قصبے میں چھوٹے بڑے زراعتی تالاب پائے جاتے ہیں، لیکن بعض تالابوں کا رقبہ اتنا بڑا ہے کہ یہ قدرتی جھیلوں کے مماثل ہیں، اور علاوہ آبپاشی کے ان کے ذریعہ سے ممالک محروسہ کے مناظر میں معتدبہ اضافہ ہو گیا ہے۔ ان بڑے کنٹوں، تالابوں جھیلوں یا "ساگروں" میں شاید سب سے پرانی جھیل پاکھال کی ہے جو ضلع ورنگل میں واقع ہے اور یہ اسی زمانہ کی یادگار ہے، جب اسی خطے پر کاکیتہ خاندان حکمران تھا[1]۔ یہ چاروں

---

۱ بلگرامی دولت، حسب بالا جلد ۱ صفحہ ۲۲ میں قدیم تالابوں کا مفصل ذکر دیا ہوا ہے۔

طرف سے پہاڑیوں اور گنجان جنگلوں سے گھری ہوئی ہے اور ممالک محروسہ کے بڑی بڑی شکارگاہوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کا پشتہ سوا میل لمبا ہے اور بھری جھیل کا رقبہ بارہ مربع میل ہو جاتا ہے۔ پاکھال کے علاوہ تین اور تاریخی تالاب ہیں جو قابل ذکر ہیں۔ بلمرگ میں علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا ایک نفیس تالاب ہے جس کا پشتہ نوسو فٹ طویل اور اوپر کی جانب سو فٹ عریض ہے۔ بلدہ حیدرآباد کی آبادی کو سکندرآباد کی انگریزی چھاؤنی سے تالاب حسین ساگر جدا کرتا ہے جسے سلطان ابراہیم شاہ قطب کے داماد حضرت حسین شاہ ولی نے ۱۵۶۲ء میں بنوایا تھا۔ اس کا پشتہ ڈھائی ہزار گز طویل ہے اور رقبہ ۸ مربع میل ہے۔ شہر سے چند میل جنوب کی طرف میر عالم کا تالاب ہے جسے ابوالقاسم خاں میر عالم، مدارالمہام نواب سکندر جاہ، آصف جاہ ثالث، نے عیسی ندی کو روک کر بنوایا اور اس طرح شہر حیدرآباد میں پینے کے پانی کا پہلا ذخیرہ قائم کیا۔ اس کا پھیلاؤ بھی حسین ساگر کے برابر ہی ہے اور پشتہ جو نہایت پختہ اور کماندار ہے۔ پون میل کے قریب طویل ہے۔

لیکن یہ تالاب رقبہ اور اپنی سودمندی کے اعتبار سے ان تالابوں اور جھیلوں کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں جو اعلیحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ کے عہد میمنت مہد میں تعمیر ہوئے ہیں۔ ان میں سے پہلا تالاب عثمان ساگر ہے جس کی بنیاد اعلیحضرت کی مسندنشینی کے سال رکھی گئی تھی۔ یہ موسی ندی پر پشتہ ڈال کر بنایا گیا ہے اور اس سے نہ صرف آبپاشی ہوتی ہے بلکہ بلدۂ حیدرآباد میں جس قدر پانی پیا جاتا ہے وہ سب اس سے صاف ہو کر آتا ہے اور ساتھ ہی اس کے ذریعہ سے طغیانی کا خطرہ، جس کا حیدرآباد کو ہمیشہ سامنا پڑتا تھا، خدا کے فضل سے رفع ہو گیا ہے۔ اس کا پشتہ ایک میل

سے زیادہ طویل ہے اور تالاب کا رقبہ ۱۰ مربع میل ہے۔ عثمان ساگر کے قریب ہی حمایت ساگر ہے جو والا شان نواب اعظم جاہ میر حمایت علیخاں بہادر کے نام نامی پر عیسی ندی کو روک کر بنایا گیا ہے۔ یہ رقبہ میں تو عثمان ساگر سے نصف ہے لیکن اس کا پشتہ عثمان ساگر کے پشتے سے کہیں زیادہ طویل ہے لیکن ان سب تالابوں سے بہت زیادہ وسیع نظام ساگر ہے جو ضلع نظام آباد میں دریائے مانجرا کے پانی کو روک کر بنایا گیا ہے۔ اس کا بند تقریباً سوا دو میل لمبا ہے اور کل رقبہ ۵۰ مربع میل سے زائد اور گہرائی اوسطاً ۱۰۰ فٹ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس تالاب کے ذریعہ سے تقریباً تیس لاکھ ایکڑ اراضی کی آب پاشی ہوسکتی ہے۔[۱۲]

آب وہوا | ممالک محروسہ کی آب وہوا نسبتاً معتدل ہے یعنی نہ تو موسم سرما میں زیادہ سردی ہوتی ہے، نہ موسم گرما میں زیادہ گرمی، اور نہ موسم بارش میں زیادہ بارش[۱۳]۔ ممالک محروسہ میں جو بھی بارش ہوتی ہے وہ زیادہ جنوب و مغربی ہواؤں کے اثر سے ہوتی ہے اور برسات کا موسم تقریباً وسط جون سے شروع ہو کر تقریباً ابتدائے ستمبر تک رہتا ہے لیکن موسم سرما کے ابتدا میں بھی مشرقی اور جنوبی ہواؤں کی وجہ سے تھوڑی بہت بارش ہوجاتی ہے، گو اس کا اثر زیادہ نہیں پڑتا۔ مرہٹواڑی اور تلنگانے کی آب وہوا میں معتد بہ فرق ہے۔ تلنگانے میں تالابوں اور جھیلوں کی بہتات کی وجہ سے یہاں کی

۱۲ـہ دیکھو مردم شماری ہندوستان حسب بالا باب (۱)۔

۱۳ـہ ممالک محروسہ کی اوسط تپش تقریباً ۸۰ ف ہے۔ آب وہوا کے لئے دیکھو بلینڈ فرڈ کی ہندوستان، برہما اور لنکا کی آب وہوا اور موسم کا عملی رہنما لندن ۱۸۸۹ء

H. F. Blandford: Practical guide to the Climate and Weathers of India, Ceylon and Burma.

آب و ہوا مرطوب ہے؛ اس کے برعکس، چونکہ مغربی موسمی ہوائیں سر بفلک مغربی گھاٹوں سے ٹکرا کر اپنی قوت کا بڑا حصہ ختم کر چکتی ہیں اس لئے مرہٹواڑی کی آب و ہوا نسبتاً خشک ہے۔ اسی وجہ سے بہ نسبت مرہٹواڑی کے تلنگانے میں زیادہ بارش ہوتی ہے اور چونکہ یہاں کی پیداوار زیادہ تر "تری" کا ہی ہے اس لئے یہ خطہ بہ نسبت اپنے ہمسایہ خطے کے زیادہ آباد ہے۔ تمام ممالک محروسہ کی بارش کا اوسط تقریباً ۳۲ انچ سالانہ ہے۔

دھاتیں) سرزمین دکن میں متعدد معدنیات پائی جاتی ہیں[۱۴] جیسے لوہا، کوئلہ، سونا، پنسل کا سرمہ، تانبا، ابرق، گیرو، اور وہ پتھر جسے شاہ آباد کا پتھر کہتے ہیں۔ یوں تو لوہا یہاں کے متعدد حصوں میں دستیاب ہو سکتا ہے، لیکن واقعاً زیادہ تر مشرقی حصے یعنی ورنگل میں کام ہوتا ہے جہاں سنگریزی میں ہزاروں آدمی اس میں لگے ہوئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ کان کنی شاہ آباد میں پتھر کی سلوں کے لئے ہوتی ہے جسے فرشوں کے کام میں لایا جاتا ہے اور جس سے نہایت نفیس سمنٹ بھی تیار ہوتی ہے جو نہ صرف ممالک محروسہ میں کام آتی ہے بلکہ دیگر حصہ جات ہند کو بھی جاتی ہے۔

حال ہی میں بلدہ حیدرآباد کے قریب بڑی لنگم پلی کے مقام پر ریہ کی پہاڑیاں بھی دریافت ہوئی ہیں جسے شیشہ آلات کے کام میں لایا جاتا ہے، چنانچہ یہاں شیشہ سازی اور رنگ سازی کے دو ایک کارخانے بھی قائم ہو گئے ہیں۔ تاریخ ہند میں گولکنڈہ ہیروں کے لئے مشہور تھا لیکن یہ ہیرا زیادہ تر دریائے تنگ بھدرا کی وادی اور نواح بلاری میں ملتا تھا اور یہ خطہ اب احاطہ مدراس میں چلا گیا ہے۔ اب بھی تھوڑا بہت ہیرا رائچور میں نکلتا ہے۔

---

[۱۴] دھاتوں کے لئے دیکھو بلگرامی و ولمسٹ، حسب بالا باب (۱) و مردم شماری ہندوستان حسب بالا باب (۵)

صنعتیں | افسوس ہے کہ ناسا عدت زمانہ سے ممالک محروسہ کی بعض نہایت مفید صنعتیں یا تو نابود ہو چکی ہیں ورنہ نابود ہونے کے برابر ہیں۔ سلطنت مغلیہ کے زمانے میں اورنگ آباد کریم نگر اور میدک کے اضلاع میں کاغذ سازی کی صنعت بڑی ترقی پر تھی لیکن بوجہ بدیسی کاغذ کی مسابقت کے اور بوجہ اس کے کہ یہ کاغذ نئے لوہے کے قلموں اور ولایتی سیاہی کے کام کا نہیں تھا اب یہ صنعت رفتہ رفتہ روبہ تنزل ہے چنانچہ اب بشکل سے دس بیس گھر ایسے ہوں گے جہاں یہ کام ہوتا ہو[۱۵] یہی کیفیت تارکشی اور کپڑے کی چھپائی کی ہے۔ کسی زمانہ میں پٹن (قدیم پیٹھان) ضلع اورنگ آباد اور خاص بلدہ حیدرآباد تاریانہ کے لئے تمام ہندوستان میں مشہور تھا۔ یہاں کے بیلے مہاراشٹر اور گجرات جاتے اور سونے چاندی کے تار سے اورنگ آباد کی کمخواب بنتی جو ہر نہج سے بنارسی کمخواب کا مقابلہ کرسکتی تھی لیکن اب سستا بدیشی تار اس کثرت سے آنا شروع ہوگیا ہے کہ اس کے سامنے دیسی تار کی مانگ بالکل نہیں رہی۔ یہی حالت کپڑے کی چھپائی کی ہے۔ پہلے یہ صنعت تقریباً تمام ممالک محروسہ میں پائی جاتی تھی اور یہاں کا چھپا ہوا کپڑا بیرون دکن بھی روانہ کیا جاتا تھا لیکن مصنوعی رنگوں کی ترویج فیشن کی تبدیلی اور ذرائع حمل ونقل کی فراوانی کے باعث دیگر خطہ جات ہندا سے چھپے ہوئے پردوں جاجموں اور لحافوں کی درآمد نیز دوسرے اسباب کی وجہ سے اس صنعت میں بھی کمی نظر آتی ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ ملک میں خام پیداوار کی کمی ہوگی۔ کپڑا بننے کے لئے روئی، تیل نکالنے کے لئے تل، چوبی کام کے لئے ساگوان اور دوسری نفیس لکڑی، یہ سب چیزیں پائی جاتی ہیں لیکن خام پیداوار زیادہ تر ملک سے

---

[۱۵] مردم شماری حسب بالا۔ غائب ہونے والی مصنوعات کے متعلق یادداشت صفہ ۱۹۰

باہر روانہ کردی جاتی ہے، چنانچہ کپاس کے موسم میں مرہٹواڑی کے اسٹیشنوں پر کپاس کے سیکڑوں گٹھے نظر آئیں گے جو بیرون ملک بھیجنے کے لئے وہاں جمع ہوتے ہیں۔ حال میں کپڑا بننے کے چند کارخانے قائم ہوئے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ اس صنعت میں روز بروز ترقی ہوتی جا رہی ہے۔ ورنگل اور محبوب نگر کے اضلاع میں ریشم کے کیڑے پالے جاتے ہیں اور ریشم کاتا جاتا ہے، چنانچہ تلنگانے کی ریشمی کھادی کا بازار نسبتاً اچھا ہے۔ حال ہی میں اسباب خانہ داری، خصوصاً لکڑی کا سامان بنانے کی طرف لوگوں کی توجہ خاص طور پر مبذول ہوئی ہے اور ممالک محروسہ میں نہایت اعلیٰ قسم کا سامان تیار ہونے لگا ہے۔ نیز سرکار عالی کی سرپرستی اور عام مقبولیت کی وجہ سے بیدر کی نقروی بچی کاری، کریم نگر کے نقروی تار کا کام، یادگیر کی ٹوپیوں کے پھندنوں اور بلدۂ حیدرآباد کے بٹنوں کی صنعتیں بھی روبہ ترقی نظر آتی ہیں۔

اسباب حمل و نقل، ریلیں اور تاریخی مقامات

جیسا اوپر اشارہ کیا گیا ہے ممالک محروسہ میں اسباب حمل و نقل میں بہت کچھ ترقی ہو رہی ہے اور تمام خطہ میں ریلوں کا گویا جال بچھ گیا ہے۔ قلمرو سرکار عالی بمبئی، مدراس اور مدراس دہلی کے راستہ میں واقع ہے اور ان شہروں کو جو ریلیں ملاتی ہیں وہ یہیں ہو کر گذرتی ہیں۔ اس کے علاوہ جو پٹری بمبئی سے دہلی جاتی ہے اس سے ملانے کے لئے ایک چھوٹی پٹری حیدرآباد سے منماڑ تک دریائے گوداوری کے متوازی بچھائی گئی ہے۔ قلمرو تاریخی اعتبار سے بہت ممتاز ہے اور علاوہ بڑے بڑے قلعہ جات کے اس کے حدود میں دکن کی متعدد سلطنتوں کے پائے تخت رہ چکے ہیں۔ خوش قسمتی کی بات ہے کہ یہ سب پائے تخت اور اکثر تاریخی مقامات یا تو کسی ریل کی پٹری پر درنہ

اس کے قریب ہی واقع ہیں۔ اس لئے اگر ہم ریل ہی کو اپنا رہنما بنائیں تو ہمیں ان میں سے اکثر سے واقفیت حاصل ہو جائے گی۔

سب سے پہلے تو چھوٹی پٹری کی اس ریل کو لیجئے جو منماڑ سے چلتی ہے اور دریائے گوداوری کے متوازی بلدہ حیدرآباد ہوتی ہوئی جنوب کی طرف میسور کو چلی جاتی ہے۔ منماڑ پر اس کا اتصال دہلی، بمبئی کی ریل سے ہوتا ہے جو تقریباً اسی راستہ پر بچھی چاہیے جو زمانہ قدیم میں شمال سے جنوب کو جاتا تھا منماڑ سے تقریباً ۶۰ میل کے فاصلہ پر ہم ایلورا آتے ہیں جہاں ہمیں ہندو، جین اور بودھ عہدوں میں کاٹے ہوئے عظیم الشان پہاڑی غار ملتے ہیں۔ اس کے بعد کا اسٹیشن دولت آباد ہے جہاں سے وہ مشہور و معروف قلعہ نظر آتا ہے جو دیوگری کے نام سے یادو راجپوتوں کا مستقر تھا اور جسے چند ماہ تک محمد بن تغلق نے اپنا پایہ تخت بنا کر تمام ہندوستان کا مستقر بنا دیا تھا۔ ایلورا اور دولت آباد کے درمیان خلد آباد کا تاریخی مقام ہے جہاں اورنگ زیب، ابو الحسن تانا شاہ، حضرت آصفجاہ اول، نواب ناصر جنگ اور ملک عنبر کے مقبرے ہیں، اور وہ مقام بھی ہے جہاں حسین نظام شاہ والی احمد نگر کی لاش سپرد خاک کی گئی تھی۔ اس کے بعد اورنگ آباد آتا ہے جو پہلے کھڑکی کے نام سے اس حبشی ملک عنبر کا مستقر رہا جس نے اپنے زمانے میں دہلی والوں کو متعدد مرتبہ نیچا دکھایا اور جہاں بیٹھ کر اورنگ زیب عالمگیر نے پچیس سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اگر غور کیا جائے تو یہ امر قابل لحاظ ہے کہ جب محمد تغلق اور اورنگ زیب نے دکن کو پوری طور پر فتح کرنا چاہا تو انھیں دہلی سے آکر اسی خطہ میں رہنا پڑا جہاں اب دولت آباد اور اورنگ آباد واقع ہیں۔ اورنگ آباد سے ۸۰ میل کے قریب شمال کی طرف مشہور عالم غارہائے اجنتہ ہیں

جہاں کی بعض دیواری تصاویر تقریباً ۱۰۰۰ برس قدیم ہیں اور آج بھی اُن میں کم و بیش وہی پُرانی چمک دمک باقی ہے جو اس بعید زمانے میں ہوگی۔ ان تصاویر سے ہمیں تمدنی، سیاسی، مذہبی تاریخ کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔

اورنگ آباد سے چالیس میل کے قریب جالنہ واقع ہے جو شاید اس حصّہ کا قدیم ترین شہر ہے، اس لئے کہ روایت کے بموجب بنو باس کے زمانے میں سیتاجی نے یہاں قیام کیا تھا۔ یہاں سے سو میل آگے نانڈیر پڑتا ہے جہاں سکھوں کے دسویں اور آخری گرو گوبند سنگھ کا مقبرہ ہے۔ نانڈیر سے ۷۵ میل چل کر نظام آباد ہوتے ہوئے (جس کا ذکر اندور کے نام سے سیواجی کے عہد کے چھاپوں میں آتا ہے) ہم محمد قطب شاہ کے آباد کردہ شہر اور قلمرو سرکار نظام کے پایہ تخت حیدرآباد پہنچتے ہیں، جس کے مغرب میں تقریباً چار میل کے فاصلہ پر قطب شاہیوں کا صدر مقام گولکنڈہ، نواب آصفجاہ ثانی کے محلات اور قطب شاہی مقبرے واقع ہیں اور شمال کی طرف دو میل کے فاصلہ پر انگریزوں کی مشہور آفاقی چھاؤنی، سکندرآباد ہے جسے خاص طور پر اسی مصرف کے لئے نواب سکندر جاہ بہادر نے آباد کیا تھا اور جس کا نظم و نسق اب انگریزی رزیڈنٹ سے متعلق ہے۔

بلدۂ حیدرآباد سے جنوب کی طرف جو چھوٹی پٹری جاتی ہے اس پر ممالک محروسہ میں صرف گدوال ہی قابل ذکر مقام ہے۔ یہ ریاست جو کرشنا اور تنگ بھدرا کے دوآبہ میں واقع ہے چار سو برس تک سلطنت وجیانگر کی باجگذار رہی اور اس وقت تک مہاراجہ گدوال کے راج میں (جو اعلیحضرت خسرو دکن کے باجگذار ہیں) قدیم ہندو روایات اور طرز تعمیر کے اثرات نظر آتے ہیں۔

بمبئی سے جو چوڑی پٹری مدراس جاتی ہے وہ اوّل الذکر بندرگاہ سے تقریباً ۳۰۰ میل پر ممالک محروسہ میں داخل ہوتی ہے۔ سرحد سے تقریباً ۵۰ میل پر گلبرگہ ملتا ہے جو ۱۳۴۷ء سے ۱۴۲۲ء تک سلطنت بہمنیہ کا پایۂ تخت رہا اور جہاں خواجہ گیسو دراز دہلی سے تشریف لائے اور یہیں وصال فرمایا۔ گلبرگہ سے ۲۶ میل پر واڑی کا اسٹیشن ہے جہاں سے ایک پٹری بلدہ حیدرآباد کو جاتی ہے۔ بمبئی، مدراس والی پٹری پر ممالک محروسہ کا آخری اہم مقام رائچور ہے جو وجیا نگر اور سلطنت دکن میں ما بہ النزاع تھا۔ یہ کچھ مدت تک یوسف عادل شاہ والی بیجاپور کا مستقر اور سنہ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۸ء تک سرکار انگریزی کے قبضہ میں رہا۔

واڑی سے چند میل کے فاصلہ پر چتاپور کا اسٹیشن ہے جہاں سے ایک میل پر ناگئی کے مندر ہیں، یہ وہ مقام ہے جہاں روایت کے مطابق سری رام چندر جی سیتا جی کی تلاش میں ٹھہرے تھے۔ ۸۰ میل کے فاصلہ پر (یعنی حیدرآباد سے ۴۵ میل) وقارآباد پڑتا ہے جہاں سے ریل ہمیں بیدر کی طرف لے جاتی ہے جو تقریباً ۲۰۰ برس تک سلطنت دکن کا پایۂ تخت رہا اور یہاں کا عظیم الشان قلعہ اور مدرسۂ محمود گاواں اب بھی اس گذرے ہوئے زمانے کی یاد تازہ کرتا ہے۔ بیدر سے ۲۵ میل شمال کی طرف اودگیر کا تاریخی مقام ہے جہاں کا قلعہ اس وقت تک اپنی اصلی حالت میں ہے۔ یہاں ریل کو چھوڑ کر سڑک سے ۴۵ میل پر قندھار کا شہرۂ آفاق قلعہ ہے جس کی ابتدا سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں ڈالی گئی، اسی مقام پر محمود خلجی سلطان مالوہ نے پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں دکھنی لشکر کو شکست دے کر بیدر پر چند روز کے لئے قبضہ کرلیا تھا، بعد میں چل کر یہ مقام ملک عنبر کا بھی مستقر رہا۔

اگر حیدرآباد سے چوڑی پٹری پر مشرق کی جانب جائیں تو سب سے پہلے بھونگیر کے پہاڑی قلعہ کے پاس ہو کر گزرنا پڑے گا جو حیدرآباد سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور جس پر پہلے کاکاتیوں کا پھر بہمنیوں کا، کچھ دن تک گولکنڈہ کا پھریرا لہرایا اور جو اب خدا کے فضل سے پرچم آصفی کے زیر سایہ ہے۔ چونکہ یہ قلعہ بہمنی سلطنت اور تلنگانہ کی سرحد پر تھا اس لئے فوجی اور سیاسی اعتبار سے اس کی بہت اہمیت تھی۔ یہاں سے ۶۰ میل کے فاصلہ پر ورنگل آتا ہے جو مدت تک آندھرا سلطنت کا پایہ تخت رہا ہے، اور ورنگل سے ۵۰ میل پر ممالک محروسہ کی جنوبی مشرقی سرحد کے قریب کھمم میٹ کا قدیم قلعہ ہے جسے سلطان قلی قطب شاہ نے فتح کرکے اپنی سلطنت میں ملحق کر لیا تھا۔

ورنگل کے قریب قاضی پیٹ سے شمال کی طرف چوڑی پٹری جاتی ہے اور سرحدی اسٹیشن بلہارشاہ پر ناگپور، دہلی کی پٹری سے مل جاتی ہے۔ قاضی پیٹ سے ۱۱۴ میل چل کر ہم سرپور پہنچتے ہیں جو مدت تک گونڈوانے کے راجاؤں کا پایہ تخت رہا، اور یہاں سے ۴۶ میل پر مانک گڈھ کا مضبوط گونڈ قلعہ واقع ہے[لہ]۔

تمدنوں کا سنگم اس مختصر نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ قلمرو سرکار عالی کس طرح عہد ہائے قدیم، وسطیٰ اور جدید کے تمدنوں کا مرکز رہی ہے اور کس طرح یہ ایک قدرتی پل کی طرح مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔ کسی نے سلطنت آسٹریا ہنگری کے متعلق کہا تھا کہ اگر ایسی سلطنت انیسویں صدی میں موجود نہ ہوتی تو بنانی پڑتی بلکہ بعض کا تو اب بھی یہ خیال ہے کہ وسطی یورپ کے امن و امان میں جو فتور پڑ رہا ہے اس کی

لہ تفصیل کے لئے دیکھو مرے۔ کتابچہ ہندوستان، برہما و سراندیپ ۱۹۲۶ء جس سے اس پارہ کا زیادہ تر سواد اخذ کیا گیا ہے۔ Murray's Handbook to India Burma and

بڑی وجہ یہی ہے کہ جنگ عظیم کے باعث اس سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور وسطی یورپ کی جنگجو اور معاند اقوام کے درمیان کوئی حاجب باقی نہ رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ سرزمین دکن نے بھی کچھ ایسا ہی موقع پایا ہے کہ حضرت آصفجاہ نظام الملک اوّل اسے اپنا نہ بنا لیتے تو بھی ایک اسی قسم کی ریاست کسی نہ کسی طرح سے یہاں بن جاتی، اس لئے کہ یہ سرزمین صرف تمدنوں کی نہیں بلکہ مختلف نسلوں زبانوں اور مذہبوں کی بھی جائے اتصال ہے اور جہاں کہیں بھی ایسی جائے اتصال ہوتی ہے وہاں ضرور کسی نہ کسی قسم کی حاجب ریاست بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر متعدد حاجب مملکتوں کو پیش کر سکتے ہیں یورپ میں سوئزرستان، جرمانی، فرانسیسی اور اطالوی تمدنوں کی جائے اتصال ہے۔ بلجیم میں یونانی اور لاطینی اثرات ملتے ہیں۔ چیکوسلوفاکیہ میں اسلانی اور جرمانی دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ ادھر ایشیا میں افغانستان، ہندی اور ایرانی تمدنوں اور کشمیر، تبتی اور ہندی تہذیبوں کے سنگم ہیں اور سیام و نیپال کو جو بھی آزادی حاصل ہے وہ اسی وجہ سے کہ یہاں بنی نوع انسانی کی دو رویں مل جاتی ہیں۔ ممالک محروسہ سرکار نظام کی حالت بھی بجنسہ ایسی ہی ہے اور اس کا سیاسی وجود اور دلچسپیاں محض اتفاقی نہیں بلکہ ان کو واقعات کا ایک لازمی نتیجہ سمجھنا چاہئے اور یہ کیفیت کہ یہاں تمام ہندوستان کے ہر صوبے، بلکہ بیرون ہند کے لوگ بھی رہتے نظر آتے ہیں، اس کی مرکزی شان کا ایک ادنیٰ مظاہرہ ہے۔

نسلیں اور زبانیں | عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ دکن دراوڑی لوگوں کا مسکن ہے اور شمال آریہ اقوام کا، لیکن یہ خیال بالکلیہ درست نہیں ہے گو بلاشبہ اگر اکثریت کو ملحوظ رکھا جائے تو اس میں حقیقت کا پہلو ضرور پایا جاتا ہے۔ دراوڑی نسل والے

ٹھگنے قد کے ہوتے ہیں، اُن کا رنگ سیاہ، سر پر گھنے بعض مرتبہ گھونگریالے بال، سیاہ آنکھیں، لمبا چہرہ، چوڑی ناک ہوتی ہے[۹] - یہ امر سمجھنا چاہیے کہ آریوں کی طرح یہ نسل بھی ہندوستان کے باہر سے شاید شمالی مغربی دروں میں ہو کر اس ملک میں آئی، چنانچہ آج بلوچستان کی براہوئی قوم کی زبان کا ایک بڑا عنصر دراوڑی باقی رہ گیا ہے - یہ دراوڑی ہندوستان میں آ کر یہاں کے بعض اصلی باشندوں سے مل گئے، اور بعض قوموں مثلاً گونڈوں، بھیلوں وغیرہ کو آباد مقامات سے نکال کر جنگلوں میں بھگا دیا - وہ خطے جہاں دراوڑی دوسری نسل والوں میں مخلوط ہو گئے گجرات اور مغربی ہند میں جہاں وہ اسکیتھیون سے ملے - اسی طرح دریائے گنگا کے وسطی خاص میں (جسے زمانۂ قدیم میں "مدھیا دیش" کہتے تھے) آریوں سے، اور بنگالہ میں تاتاریوں سے مل گئے - بندھیاچل کے جنوب میں خصوصاً اس خطے میں جہاں قلمرو سرکار عالی واقع ہے، کم و بیش اصلی دراوڑی پائے جاتے ہیں اور یہ زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو تلنگی اور کنڑی زبانیں بولتے ہیں[۱۰]۔

تلنگی، کنڑی اور مرہٹی زبانیں بولنے والوں کے علاوہ، جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے ملک ہند کا تقریباً وسطی حصہ ہونے کی وجہ سے سرزمین دکن نہ صرف شمالی اقوام کی آماجگاہ بنی رہی ہے بلکہ اقصائے جنوب کے قریب کے باعث اس حصہ ملک کی آبادی کا عنصر بھی بہت کچھ نمایاں ہے، چنانچہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ممالک محروسہ کے وہ لوگ جو احاطہ مدراس میں پیدا ہوئے تھے تعداد میں ۱۴۲۰۰۰ تھے

---

[۹] کیمبرج کی تاریخ ہند جلد ۱ باب ۲ صفحہ ۴۰ Cambridge History of India. VOL I

[۱۰] ایضاً باب ۲

بمبئی والے ۹۰ ہزار، ممالک متوسط و برار والے ۱۴ ہزار، صوبہ آگرہ و اودھ کے پیدائشی ۹۰ ہزار اور پنجابی ۲ ہزار[15]، جس سے یہ فطری امر منکشف ہوتا ہے کہ جو صوبے مثلاً مدراس و بمبئی ممالک محروسہ سے قریب تر ہیں اُن کے رہنے والے یہاں زیادہ تعداد میں آباد ہو گئے۔ برخلاف پنجاب و صوبہ آگرہ کے جہاں کے باشندے بُعد مسافت کی وجہ سے کم تعداد میں دکن آتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہاں کے مقتدر طبقہ میں بہت سے لوگ یا تو ان ایرانیوں عربوں اور ترکمانوں کی اولاد سے ہیں جو بہمنی سلاطین یا اُن کے جانشینوں۔ عادل شاہی۔ نظام شاہی اور قطب شاہی فرمانرواؤں کے عہد میں مغربی ساحل ہند کے راستے سے آئے، ورنہ ان سے بھی زیادہ ممتاز وہ امرا ہیں جو اپنے آپ کو "آصفجاہی" کہلانا صحیح طور پر باعثِ فخر سمجھتے ہیں اور جو حضرت آصفجاہ اول کے ساتھ دہلی اور اس کے نواح سے یہاں آکر آباد ہو گئے۔ آجکل باہر سے جو لوگ ممالک محروسہ میں آتے ہیں وہ زیادہ تر دکن کی سرکاری زبان اردو، ورنہ یہاں کی دوسری مروجہ زبانیں یعنی مرہٹی۔ تلنگی اور کنڑی بولتے ہیں۔

ممالک محروسہ میں تلنگی بولنے والے سب سے زیادہ ہیں یعنی منجملہ ۱½ کروڑ کے ۷۰ لاکھ، مرہٹی بولنے والے ۳۶ ¾ لاکھ اور اردو و کنڑی بولنے والے بتدریج پندرہ لاکھ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے لیکن یہ غلط ہے اس لئے کہ یہاں کی مردم شماری کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بعض مسلمانوں نے اپنی مادری زبانیں مرہٹی اور تلنگی بتائی ہیں دہاں تقریباً ۹۰ ہزار ہندوؤں، ۱۲ ہزار اچھوتوں، ۴ ہزار عیسائیوں، ۱½ ہزار سکھوں، ۳ ہزار خانہ بدوشوں اور چار سو جینیوں نے

---

[15] مردم شماری سنہ ۱۹۳۱ع حسب بالا جلد ۲۳، حصہ ۲ صفحہ ۲۴۳ -

اسی قومی اور ملکی زبان کو اپنی مادری زبان بتایا ہے[20]۔ ان اہم زبانوں کے علاوہ قلمرو کے بعض اضلاع میں دوسری زبانیں بھی جیسے گونڈی، بھیلی، لمباڑی وغیرہ بھی بولی جاتی ہیں جو ان اقوام کو ظاہر کرتی ہیں جنھیں غالباً دراوڑی نو آمدوں نے اسی طرح جنگلوں میں بھگا دیا یا اپنا خادم بنا لیا جیسے شمالی آریوں نے شودروں کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔

مذہب قلمرو سرکار عالی میں ہندوستان کے تقریباً سب ہی ممتاز مذاہب پائے جاتے ہیں، اور گو بیشتر آبادی باقیماندہ ہندوستان کی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے لیکن ان کے علاوہ یہاں پونے دو ہزار پارسی (جو زیادہ تر بلدہ حیدرآباد میں تجارت صنعت و حرفت اور ملازمت کے شعبوں میں نظر آتے ہیں) پانچ ہزار سکھ (جو زیادہ تر حیدرآباد اور ناندیر میں آباد ہیں) اور ڈیڑھ لاکھ عیسائی (جن کی تعداد پچھلے دس برس میں دگنی ہوگئی ہے) موجود ہیں۔ ہندوؤں کی تعداد باقی سب مذہب والوں سے زیادہ ہے، اور اگر پنچ ذات کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل آبادی کا ۸۵½ فیصد حصہ ہندوؤں پر مشتمل سمجھا جانا چاہیے۔ باوجودیکہ مسلمانوں کے شاہی خاندان اس خطہ پر برابر ۶۰۰ برس سے حکومت کر رہے ہیں لیکن (شاید اسلامی رواداری کے باعث) تمام ممالک محروسہ میں مسلمانوں کی آبادی صرف ۱۵ لاکھ ہے۔ جن میں سے ۱½ لاکھ مرہٹواڑی میں اور ۶½ لاکھ تلنگانہ میں ہیں، چنانچہ مسلم آبادی کا حساب لگایا جائے تو دس فیصد سے کچھ ہی زیادہ ہوگی[21]۔ اس خطے کے فرمانرواؤں کے خاص مسلک کی وجہ سے گو یہاں ہندوستان کے تقریباً سب ہی مذہب والے پائے جاتے ہیں لیکن دوسرے

---

[20] مردم شماری ۱۹۳۱ء حسب بالا صفحہ ۲۲۴

[21] مردم شماری ۱۹۳۱ء حسب بالا حصہ ۲ صفحہ ۲۴۰ و ۲۴۱

حصہ جات ملک ہند کے برخلاف یہ سب یہاں بالکل شیر و شکر ہوکر رہتے ہیں۔ دکن کے لئے یہ کوئی انوکھی بات نہیں کہ بادشاہ مسلمان ہو اور وزیر ہندو، یہ تو یہاں ہوتا ہی آیا ہے، اور ہر تاریخ ہیں یہ شہادت دے سکتا ہے کہ ابتدا ہی سے یہاں کی رواداری ضرب المثل رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ احمد نگر کے دوسرے موسس ملک عنبر ہی نے مرہٹوں کو اتنا جری اور گھوڑ چڑھا بنا دیا، سیوا جی اور اُس کے جانشینوں کی فوج میں ہندو لڑتے تھے تو ان کے دوش بدوش عرب بھی جان دیتے تھے اور قطب شاہیوں کے سب سے مشہور خادم دو برہمن وزرا اکنا اور مادنا تھے۔ خود عہد آصفجاہی میں بھی رواداری کا وہی عالم رہا ہے اور حضرت آصفجاہ اول سے لے کر اعلیحضرت آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ تک متعدد وزرائے عظمٰی اور دیگر وزرا، ہندو اور پارسی رہ چکے ہیں۔ دکن کے تاریخی حدود اگر تاریخ دکن پر نظر ڈالی جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ جو خطہ آجکل قلمرو سرکار آصفیہ کہلاتا ہے وہ اس بڑے رقبہ کا محض ایک جزو ہے جو طبعی اور تاریخی اعتبار سے اس میں شامل رہا ہے۔ یوں تو مرہٹواڑی میں وہ تمام ملک داخل سمجھا جاسکتا ہے جہاں مرہٹی زبان بولی جاتی ہے، لیکن مغربی گھاٹ کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ وہ سیاسی اعتبار سے دکنی سطح مرتفع اور کوکنی میدان کے درمیان حد فاصل کا کام دیتے ہیں، چنانچہ جب کبھی کوکنیوں نے مشرق کی یا دعیوں نے مغربی ساحل کو ملحق کرنا چاہا تو انھیں دقتیں اُٹھانی پڑیں اور شدید مزاحمتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آندھرا اقوام اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی مغربی گھاٹ کی قدرتی سد راہ سے آگے نہیں بڑھ سکی! یہی کیفیت آئندہ چل کر شتت واہن خاندان چالوکیوں اور یادوں کی تھی اسی طرح

اگر دکن کے قدرتی سیاسی حدود قائم کئے جائیں تو شمال میں تاپتی کم و بیش مستقل شمالی حد ہو گی اس لئے کہ ستواہنوں نے تقریباً یہیں تک اپنی حکومت قائم کی. چالوکی اپنی سلطنت کو یہیں تک وسعت دے سکے اور بہمنیوں کی شمالی سرحد ممالک متوسط میں کھرلا کا تاریخی مقام سمجھنا چاہیئے. مشرق میں اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر تک گوداوری اور کرشنا کا دوآبہ ہمیشہ اسی حکومت کے ماتحت رہا ہے جو ورنگل اور تلنگانے پر قابض رہی ہے اور یہ صرف حال ہی کا واقعہ ہے کہ (اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر تک) مچھلی بندر کا علاقہ پہلے فرانسیسیوں کے سپرد کیا گیا اور ان کے زوال پر انگریزوں کے حوالہ کر دیا گیا۔ جنوب میں دکن کے حدود ہمیشہ گھٹتے بڑھتے رہے ہیں۔ رائچور کا دوآبہ ہمیشہ دکھنی اور جنوبی[۲۲] سلطنتوں کے درمیان مابہ النزاع رہا ہے اور اس کے محل وقوع کے باعث یہ کبھی وجیانگر کا ہو جاتا کبھی بہمنیوں کا لیکن ۱۵۶۵ء کی ہزیمت کے بعد وجیانگر کا کل علاقہ دکھنی سلطنتوں کے قبضہ میں آگیا اور اس کا بیشتر حصہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے درمیان تقسیم ہو گیا چنانچہ جب ان دونوں سلطنتوں پر شہنشاہ اورنگ زیب کو غلبہ ہوا تو گویا اُس کے قبضہ میں وجیانگر کا تمام قدیم علاقہ جو اقصائے جنوب تک پھیلا ہوا تھا، آ گیا۔ اورنگ زیب کے بعد یہ سب حصہ ملک مختلف ہاتھوں میں گذر کر حضرت آصف جاہ اول کے قبضہ میں آیا اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ان کا حکم دریائے تاپتی سے میسور کے جنوب تک چلتا تھا۔

حضرت آصف جاہ اول کی وفات سے ۱۸۵۷ء تک ممالک محروسہ کے رقبہ میں برابر کمی بیشی ہوتی رہی۔ پہلے اقصائے جنوب سے عملداری ہٹی، پھر میسور آزاد

---

[۲۲] "دکھنی" اور "جنوبی" فرق کے لئے دیکھو حاشیہ ۲ حسب بالا۔ بغیر دار کر حسب بالا۔

ہوا اور اس کے بعد بلاری۔ کڑپہ، اننتاپور گئے، ازاں بعد کرنول نکلا اور لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں رائچور کا دوآبہ بھی سرکار انگریزی کی عملداری میں چلا گیا یعنی قلمرو کی جنوبی سرحد دریائے کرشنا قرار پائی۔ شورش ۱۸۵۷ء کے بعد رائچور واپس مل گیا یعنی جنوبی حد بجائے کرشنا کے تنگ بھدرا رہی لیکن اس کے علاوہ باقی تمام جنوبی حصہ قلمرو سے باہر ہی رہا اور آج کل تو عرف عام میں "دکن" یہیں ختم ہوجاتا ہے اور اس کے بعد کا حصہ "جنوبی ہند" میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ مشرق میں کرناٹک جو نظامت دکن کے ماتحت ایک نوابی تھی، انوار الدین خاں اور چندا صاحب کے جھگڑوں میں قلمرو سے علیحدہ ہوا پھر مچھلی بندر، مصطفےٰ نگر، گنٹور، راجمندری اور چکاکول جنھیں مجموعی طور پر شمالی سرکاریں کہتے ہیں، پہلے فرانسیسیوں کو اور پھر انگریزوں کو مل گیا۔ مغرب میں بھی اسی طرح مد و جزر کی کیفیت رہی۔ سنہ ۱۷۶۰ء میں مرہٹوں نے قلعہ دار کو رشوت دے کر احمد نگر پر قبضہ کیا اور صلحنامہ اودگیر کے ذریعہ سے اسیر گڑھ اور بیجاپور، ضلع بیدر کا ایک حصہ اور پورا صوبہ اورنگ آباد ان کے ہاتھ آئے اور سنہ ۱۸۰۳ء کے مہمات تک ممالک محروسہ کی موجودہ مغربی حد قائم نہیں ہوئی۔ شمال میں صوبہ برار سنہ ۱۸۵۳ء سے برابر سرکار عظمت مدار کے قبضہ میں ہے گو وہ اس وقت بھی ممالک محروسہ کا جزو قرار دیا جاتا ہے اور سرکار انگریزی سرکار نظام کو ــــ لک روپیہ کلدار بطور پٹہ کے دیتی ہے۔ سنہ ۱۸۵۷ء سے اس وقت تک ممالک محروسہ کے رقبہ میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ حال ہی میں مبارک عہد عثمانی میں ایک اور حصہ واپس آگیا ہے۔ حیدرآباد کا وہ محلہ جسے "رزیڈنسی بازار" کہتے تھے اور جو برطانوی رزیڈنسی کے چاروں طرف تقریباً پون پون میل پھیلا ہوا تھا سنہ ۱۹۳۳ء میں اعلیحضرت کی عملداری میں واپس آگیا اور اسی مناسبت سے اس کا نام "رزیڈنسی بازار"

بدل کر سلطان بازار رکھ دیا گیا ہے۔

اگر طبعی اور تاریخی دونوں کیفیات کو ملحوظ رکھا جائے تو "دکن" سے مراد وہ قطعہ زمین ہوگا جس کے شمال میں دریائے تاپتی، وردھا اور پائین گنگا اور جنوب میں دریائے تنگ بھدرا واقع ہیں اور جس میں مغربی گھاٹ تک تمام سطح مرتفع اور مشرق میں گوداوری و کرشنا کا دوآبہ (جس کا سب سے ممتاز شہر مچھلی بندر ہے) شامل ہیں۔ لیکن اس تمام خطہ پر پرچم آصفی نہیں لہراتا بلکہ جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے اس کے حدود شمال، شمال و مغرب اور مغرب میں مغربی علاقہ اور برار کے نکل جانے کی وجہ سے محض مصنوعی ہو گئے ہیں یعنی کوئی دریا یا پہاڑ برطانوی علاقہ اور قلمرو دکن کے مابین مسلسل حائل نہیں اور مشرق میں گوداوری کرشنا کا دوآبہ یعنی مچھلی بندر کا علاقہ نکل جانے کی وجہ سے یہی کیفیت مشرقی سرحد کے ایک جزو کی بھی ہو گئی ہے۔

قلمرو آصفی کی موجودہ سیاسی تقسیم جو حصہ اس وقت قلمرو دکن میں شامل ہے وہ تین حصوں میں تقسیم ہے یعنی دیوانی، صرف خاص مبارک، جاگیرات و سمستھان۔[۲۳] دیوانی کا علاقہ وہ علاقہ ہے جو براہ راست حکومت سرکار عالی کے ماتحت ہے۔ اس کی تقسیم تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ آج بھی وہی ہے جو نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول نے آج سے ساٹھ برس پہلے کی تھی۔ قلمرو چار صوبوں یعنی اورنگ آباد، گلشن آباد میدک، ورنگل اور گلبرگہ میں منقسم ہے اور ان میں سے ہر ایک صوبہ کئی کئی اضلاع میں اور ہر ضلع کئی کئی تعلقوں یا تحصیلوں میں منقسم ہے۔ صوبہ اورنگ آباد میں اضلاع اورنگ آباد، بیڑ، پربھنی، ناندیڑ

---

۲۳ صرف خاص مبارک، جاگیروں اور سمستھانوں کی تفصیل کے لئے دیکھو چراغ علی "حیدرآباد بعہد سر سالار جنگ"
Chiragh Ali: Hyderabad under Sir Salar Jung بمبئی ۱۸۸۵ء جلد ۱ باب ۱

محمد آباد بیدر، صوبہ گلشن آباد میدک میں اضلاع میدک، نظام آباد، محبوب نگر، نلگنڈہ، صوبہ ورنگل میں اضلاع عادل آباد، کریم نگر، ورنگل اور صوبہ گلبرگہ میں اضلاع عثمان آباد، گلبرگہ اور رائچور شامل ہیں[۱۴]۔

علاقہ صرف خاص مبارک وہ علاقہ ہے جو اعلیحضرت خسرو دکن کی ذاتی جاگیر ہے جس کا انتظام اور آمدنی کلیتہً حضور پرنور سے متعلق ہے۔ یوں تو یہ علاقہ تمام قلمرو میں پھیلا ہوا ہے لیکن اس کا بیشتر حصہ بلدہ حیدرآباد کے ہر چہار طرف واقع ہے جسے یکجا کرکے اس کا ایک ضلع اطراف بلدہ بنا دیا گیا ہے۔ جاگیروں اور سمستھانوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ جاگیروں کی طرف سے سرکار عالی کو کچھ نہیں دیا جاتا بلکہ وہ دراصل پرانی طرز کی التمغوں کے مماثل ہیں جن کی بنیاد فوجی ضروریات پر رکھی گئی تھی لیکن سمستھان گویا سرکار عالی کی باجگذار ریاستیں ہیں جن پر راجے مہاراجے حکومت کرتے ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم ریاستیں ونپرتی اور گدوال ہیں۔ جاگیروں میں سب سے ممتاز جاگیریں وہ ہیں جو پائگاہ کہلاتی ہیں اور جو تین بڑے بڑے امیر خاندانوں کے قبضے میں ہیں۔ علاقہ صرف خاص کا رقبہ ۱۱۳۳ مربع میل، پائگاہوں کا مجموعی رقبہ ۳۲۲۰۳ مربع میل اور تمام دوسری جاگیروں کا رقبہ تقریباً ۴۲۰۰ مربع میل ہے۔

ہارون خاں شروانی

---

[۱۴] قلمرو کے عام نظم و نسق کے لئے دیکھو "رپورٹ حکومت قلمرو سرکار عالی"

تاریخ ورنگل

خاندان کاکتیہ

تیرھویں صدی کی تاریخ دکن دورہنود میں خاندان کاکتیہ کے راجگان ورنگل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بسلسلہ نسب کے اعتبار سے راجگان ورنگل مہابھارت کے مشہور سورما ارجن کی اولاد میں شمار کئے جاتے ہیں۔ بموجب روایات قدیم ارجن کی آٹھویں پشت میں نندا نامی ایک بلند حوصلہ شخص گذرا ہے جس نے شہر نند گیری یعنی نانڈیر کی بنیاد ڈالی نندا کی ایک لڑکی اور ایک لڑکا تھا لڑکی کا فرزند ورشنیا اور لڑکے کا بیٹیا اگنی ورنا تھا۔ ورشنیا کی اولاد ورشتی کولا کہلاتی تھی ورشنیا کا باپ سیتابھانو نامی یادو خاندان سے تھا مگر چونکہ ان کا خاندانی دیو ورشتی کولا مانا گیا تھا اس لئے یہ خاندان ورشتی کولاہی کے نام سے موسوم ہو گیا اگنی ورنا کے کئی بیٹے تھے باپ کے انتقال پر کچھ نے خانہ جنگی میں داعی اجل کو لبیک کہا اور کچھ خاندان ورشتی کولا کے زیر حمایت آگئے چنانچہ اس طرح دختر نندا کا ہونہار فرزند ورشنیا مالک تخت وتاج بن گیا اور اولاد نرینہ کا سلسلہ یہاں ختم ہو گیا۔ اسی ورشنیا کی اولاد میں ایک راجہ ورشتی چندرا دیو نامی ہوا ہے اس نے کندورم یعنی قندھار کو اپنا پایہ تخت بنایا اس کے بعد اس کا بیٹا گنم دیوراج تخت نشین ہوا اور اس کے انتقال پر اس کا بیٹا سوما دیوراج راجہ تسلیم کیا گیا سب سے پہلی مرتبہ اسی دیوراج کے

دوران حکومت میں ریاست کلیانی کے مشہور اولوالعزم راجہ بلہادیو نے ریاست قندہار پر چڑھائی کی۔ اس کی کثیر فوج کے سامنے دیوراج کی کوئی جنگی تدبیر نہ چلی اور بالآخر ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد سوما دیوراج مارا گیا اس مقتول راجہ کی رانی مسماۃ سرپال دیوی جو حاملہ تھی، عزت ریزی اور دشمن کے متوقع ناجائز سلوک کے خوف سے قندہار سے فرار ہو کر ہنکنڈہ آئی اور ایک پروہت مسمی مہادیو ورما کے مکان میں پناہ گزین ہوئی[۵] رحمدل برہمنوں نے اس رانی کی عظمت رفتہ کا خیال کر کے بہرصورت اس کی جان بچانا اپنا فرض اولین سمجھا چنانچہ جب کٹک پایہ تخت ریاست کلیان کے راجہ کو رانی سرپال دیوی کے بقید حیات ہونے کا علم ہوا تو وہ اس خبر کی تصدیق کے لئے ہنکنڈہ آیا ہوشیار اور زمانہ شناس برہمن پروہت مہادیو ورما نے نہایت ہی چالاکی سے کام لے کر رانی سرپال دیوی کو ہنکنڈہ کے ایک غریب برہمن کی عورت ثابت کیا۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں تمام برہمنوں نے راجہ کے سامنے سرپال دیوی کے ہاتھ سے چنا ہوا کھانا بطیب خاطر کھایا راجہ کو بھی اس امر کا یقین ہو گیا کہ واقعی سرپال دیوی ایک برہمن عورت ہے ورنہ ہرگز برہمن پجاری اس کے ہاتھ کا چنا ہوا کھانا نہ کھاتے کیونکہ برہمن پجاری غیر برہمن قوم کی عورت کا تیار کردہ کھانا نہیں کھاتے جب اس طرح سے راجہ بلہادیو کا شبہ دور ہو گیا تو نہ صرف اُس نے رانی سرپال دیوی کی جان بخشی کی بلکہ اس کی گذر اوقات کے لئے کچھ وظیفہ بھی مقرر کر دیا جب حمل کی مدت ختم ہوئی تو اُس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اس لڑکے کا نام رانی سرپال دیوی نے بطور یادگار احسان مندی پروہت مذکور مہادیو ورما

---

[۵] منقول از پرتاب چرت۔

رکھا۔ کہتے ہیں کہ اس لڑکے پر پدماکشی دیوی جس کا مندر ہنمکنڈہ کے پہاڑ پر واقع ہے بہت مہربان تھی اس کی پیشین گوئی تھی کہ یہ لڑکا ایک وسیع سلطنت کا مالک ہوگا چنانچہ جب یہ لڑکا مہادیو وربا سن شعور کو پہونچا تو اس نے فوج کثیر فراہم کرکے ہنمکنڈہ اور اس کے مضافات پر قبضہ کرلیا۔ یہ پہلا عالی ہمت فرد ہے جس نے ہنمکنڈہ کی عظمت کی بنیاد ڈالی اور ایک جداگانہ سلطنت کا بانی ہوا جس کا مستقر زمانہ مابعد میں ورنگل قرار پایا۔ مہادیو وربا نے تقریباً ۹۳۹ء سے ۱۰۱۴ء تک حکومت کی اس کے بعد مسلسل آٹھ حکمرانوں نے ۱۰۱۴ء سے ۱۰۶۲ء تک حکومت کی جن کے نام سلسلہ وار یہ ہیں۔

نام راجہ	مدت حکومت	نام راجہ	مدت حکومت
(۱) پدماینا	۷۴ سال	(۲) دنمارراج	۷۳ سال
(۳) پرانگی دنماراج	۷۲ سال	(۴) دنتی گنڈاراج	۷۰ سال
(۵) کشلادیوی	۱۹ سال	(۶) ارکادیوراج	۱۷ سال
(۷) بھوانیکہ مل	۶۸ سال	(۸) ترہی بھوانیکہ مل	۷۶ سال

افسوس ہے کہ مذکورہ بالا راجاؤں کے تفصیلی حالات باوجود سخت تلاش اور جستجو کے دستیاب نہ ہوسکے۔ یاد رہے کہ اس خاندان کے راجہ ابتداء میں مہادیو وربا کے زمانے سے لے کر تقریباً ترہی بھوانیکہ مل کے دور تک ایک چھوٹے سمستان ہنمکنڈہ کے مالک تھے۔ یہ اپنے مقبوضہ علاقے کے مختار مطلق اور مشرقی سلطنت چالوکیہ کے معزز باجگذاروں میں سے تھے لیکن جوں جوں راجگان چالوکیہ کی قوت میں ضعف آتا گیا مذکورہ بالا راجگان ہنمکنڈہ کی عظمت اور شوکت میں اضافہ ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ ان

راجاؤں نے اپنی حکومت کا دائرہ اقتدار بڑھا کر اور اپنی فراست اور تدبر سے کل ملک تلنگانہ پر قابض و متصرف ہو کر اپنی اولوالعزمی اور عالی ہمتی کا ثبوت دے دیا اس خاندان کے ایک راجہ ونتی ناگندم راج نے شاید پرانی دشمنی کی بنا پر علاقہ کٹک کلیان پر چڑھائی کی اور ایک خونریز جنگ کے بعد کٹک کلیان کے راجہ کو شکست فاش دی لیکن بالآخر دونوں میں بدیں شرائط صلح ہو گئی کہ کٹک کا راجہ سالانہ خراج دیا کرے۔ مگر اس وعدہ کی پابندی نہ ہو سکی۔ ونتی گندم راج نے جس وقت رحلت کی اس کا لڑکا ارکا دیو راج شیر خوار تھا اس لئے اس کی پھوپھی کشلا دیوی نے ۱۹ سال تک اس ریاست کو سنبھالا اسی کمسن راجہ کے دور میں کٹک راجہ نے دوبارہ ہنمکنڈہ پر چڑھائی کی لیکن ایک ہولناک جنگ کے بعد کٹک کلیان کا راجہ ہزیمت اٹھا کر واپس چلا گیا۔

ارکا دیو راج بڑا ہی بلند ہمت اور عالی حوصلہ راجہ تھا اس نے دیوگری پر حملہ کر کے وہاں کے راجہ کو اپنا مطیع اور باجگذار بنایا اس واقعہ نے ورنگل کی آئندہ تاریخ پر زبردست اثر ڈالا۔ تری بھوانی مل نے اپنے دور حکومت میں کٹک کلیان کے راجہ سے پھر چھیڑ چھاڑ کی اور ہنگام کارزار میں کٹک کے راجہ کے ولی عہد ریاست کو قتل کر ڈالا۔ کاتی پردل راج ۱۱۲۶ء میں تخت نشین ہوا جس نے حقیقت میں سلطنت ورنگل کی بنیاد مستحکم کی اسی کے باپ تری بھوانی مل متوفی ۱۱۲۶ء کے دور میں ہنمکنڈہ تلنگانہ کا مرکز قوت سمجھا جاتا تھا لیکن پردل راج نے شہر ورنگل کو سب سے پہلی مرتبہ آباد کیا شہر ورنگل کے آباد کرنے کے متعلق ایک عجیب و غریب حکایت بیان کی جاتی ہے جو تاریخی اعتبار سے بہت کچھ محتاج تنقید ہے مشہور

ہے کہ ہنمکنڈہ سے چند لوگ نمک لانے کے لئے جانب مشرق قریبی مواضعات سے گئے ہوئے تھے جب وہ اپنا مال و اسباب لے کر ہنمکنڈہ واپس آرہے تھے ایک مقام پر بنڈی کا پہیہ کسی پتھر سے ٹکرا کر رک گیا اور بنڈی گر پڑی پہیہ پر جو لوہٹ کا پٹہ لگا ہوا تھا سونا ہو گیا جس پتھر سے وہ ٹکرایا تھا، درحقیقت وہ سنگ پارس تھا جب راجہ کو اس واقعہ کی اطلاع کی گئی تو وہ فوراً بر سر موقع پہونچ گیا اور اس پتھر کو نکلوا کر ہنمکنڈہ لانا چاہا لیکن وہ پتھر جہاں تھا وہیں رہا اس نے جنبش تک نہ کی ایسی نایاب چیز کی حفاظت چونکہ بے حد ضروری تھی اس لئے راجہ نے اس کی پوجا کی غرض سے ایک دیول شمبھو لنگم گڑی تعمیر کرایا جو قلعہ کے اندر اب تک موجود ہے۔ اسی پارس پتھر کے اطراف پرول راج نے ایک عالیشان قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا کہتے ہیں کہ اس قلعہ کی تعمیر کے لئے سنگ تراش و معمار قوم کے دراوڑی جو اپنے فن کے استاد مانے جاتے تھے اور جنوبی ہند کے علاقوں سے جہاں تلنگی اور تامل زبان کثرت سے بولی جاتی تھی طلب کئے گئے تھے چونکہ ان معماروں کو اس امر کا کافی علم تھا کہ یہ قلعہ ایک پتھر کی حفاظت کے لئے تعمیر کیا جا رہا ہے اس لئے اپنی زبان میں اس قلعہ کو اوروگل کہنے لگے لفظ اور و کے معنی ایک کے ہیں اور گل کے معنی پتھر کے ہیں اور مجموعی معنی ایک پتھر کے ہوئے۔ دوسری روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ یہ قلعہ ایک گول پہاڑی کے اطراف واقع ہے جو ایک بلند چٹان ہے اس لئے اس قلعہ کا نام اوروگل پڑ گیا جو بعد میں کثرت استعمال سے ورنگل ہو گیا الغرض عہد سلطنت کاکتی پرول راج میں ہنمکنڈہ کی بجائے ورنگل دارالسلطنت قرار پایا کاکتی پرول راج بڑا ہی جوانمرد دلیر اور عالی حوصلہ راجہ تھا اس نے اپنی

سلطنت میں بہت سے نئے علاقوں کا اضافہ کیا اُس کے کئی باجگذار رئیس تھے، جن کے منجملہ ایک تیلپا نامی راجہ تھا جس کو عدم ادائی خراج کے الزام میں گرفتار کرکے قید کر دیا تھا لیکن ڈاکٹر بھنڈارکر اس راجہ کو مغربی چالوکیہ خاندان کا راجہ قرار دیتے ہیں جو تامل ملک پر حکمراں تھا اس راجہ کے سپہ سالار بسی وجالا نے اپنے مالک تیلپا کا تخت و تاج چھین کر خود ریاست پر قابض ہونے کی کوشش کی کاکتی پرول راج نے اسی سپہ سالار کی مدد کی اور بالآخر تیلپا گرفتار ہوکر قید کر دیا گیا لیکن نیک طینت کاکتی پرول راج اس فعل سے سخت منفعل اور شرمندہ ہوا اس لئے کہ تیلپا چالوکیہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور ایک عرصہ دراز تک راجگان خاندان کاکیتہ اس مشرقی چالوکیہ خاندان کے راجاؤں کے باجگذار رہے تھے۔ اور ان کو اپنا آقا تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی اسی بزرگی اور عظمت کی تذلیل نے پرول راج کو سخت نادم اور خفیف کیا اور بعد گرفتاری اپنے آقا تیلپا کو عزت و توقیر اور کمال محبت اور اخلاص سے رہا کرکے اس کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کی اور ان کو مغلوب کیا پرول راج کی تاخت شمال میں دیوگڈھ تک اور مغرب میں کوکن کے علاقہ تک ہوچکی تھی۔ اس لئے ان علاقوں کے راجہ پرول راج سے مرعوب ہوگئے تھے۔ مشرق میں کٹک تک اس کی سطوت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور جنوب میں پنیار ندی تک لوگ اس کی شوکت کا لوہا مان چکے تھے

الغرض اپنی اولوالعزمی اور عالی ہمتی سے پرول راج نے عظیم الشان کاکیتہ خاندان کی بنیاد مستحکم طریق پر ڈال دی چونکہ پرول راج کے خاندان والے کاکتی دیوی کی پوجا کرتے تھے اس لئے اس خاندان کا نام کاکیتہ مشہور ہوگیا۔ پرول راج کی بیوی پما دیوی نہایت ہی منکسر المزاج اور حلیم الطبع رانی تھی اسی کے بطن سے پرتاب رودرا اول

پیدا ہوا تھا بیان کیا جاتا ہے کہ شاہی برہمن جوتشی نے اس کی پیدائش کو ماں باپ کے حق میں منحوس قرار دیا تھا چنانچہ اسی بدشگونی کی بنا پر پرتاب رودرا کی پرورش شمبھو لنگم مندر میں ہوئی تھی کہ وہ سن شعور کو پہونچ گیا پرتاب رودرا کے متعلق یہ عجیب وغریب روایت بیان کی جاتی ہے کہ اس نے دھوکہ میں اپنے باپ پرول راج کو بوقت شب قتل کرنے کی نہایت ہی خطرناک کوشش کی بیٹے کی تلوار کا کاری زخم کھا کر پرول راج حالت نزع میں تھا اور مقام حیرت ہے کہ دونوں باپ بیٹے سخت ملول تھے چنانچہ جب پرتاب رودرا کو اس حادثہ جانکاہ کا علم ہوا کہ دراصل جس شخص پر دشمن ہونے کے دھوکہ میں اس نے رات میں تلوار کا وار کیا تھا وہ حقیقت میں اس کا باپ پرول راج تھا وہ مارے غم کے نیم جاں ہو گیا مگر جب پرول راج کو بھی اس امر کا علم ہو گیا کہ واقعی یہ حادثہ نادانستہ طور پر اور لاعلمی کی بنا پر وقوع میں آیا ہے تو اس نے کمال محبت اور بے نظیر ایثار سے کام لے کر اپنے فرزند پرتاب کے جرم کو معاف کر دیا اور یہ وصیت کی کہ اس نادانستہ جرم کی پاداش میں بطور کفارہ مقامات مقدسہ الہ آباد اور بنارس کی زیارت کرے اور ایک ہزار ستون کی یادگار زنانہ دیول (مندر) تعمیر کرے چنانچہ پرتاب رودرا نے اپنے مقتول باپ کی وصیت کو حرف بہ حرف پورا کیا اور ہنمکنڈہ میں وہ عظیم الشان دیول تعمیر کرایا جو اب تک مرجع خلائق بنا ہوا ہے اور جس کے در و دیوار اپنی عظمت رفتہ کا پُر درد مرثیہ زبان حال سے سنا رہے ہیں۔ اس دیول کی تعمیر ۱۱۳۲ء میں شروع ہو کر ۱۱۶۲ء میں ختم ہوئی۔ ہر راجہ کے دور حکومت میں اس مندر کی شان و شوکت دوبالا ہوتی گئی یہاں تک کہ تیرھویں صدی ہی کے اوائل میں ملک تلنگانہ کا مذہبی مرکز بن گیا۔

پرتاب رودرا اول ۱۲۹۶ء تا ۱۳۰۴ء | مختصر یہ کہ پردل راج کی حسرت ناک موت کے بعد ۱۲۹۶ء میں پرتاب رودرا تخت نشین ہوا یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ پردل راج کی موت محض افسانہ ہے یا یہ کہ ایک امر واقعہ ہے۔ تاریخی تنقید کے اصول پر اگر اس افسوس ناک واقعہ کو جانچا جائے تو مختلف اعتراضات ایک مورخ کے ذہن میں پیدا ہو جاتے ہیں اول تو یہ کہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک بیٹا اپنے باپ کو اپنے ہی مکان میں دشمن ہونے کے دھوکہ میں قتل کر دے؟ کیا دوسرے ممالک کے جاسوس پردل راج کا بھیس بدل کر اکثر شاہی محلات میں آتے تھے اور کیا ان کی اس جاسوسی کا پرتاب رودرا کو علم تھا اور کیا ایسے جاسوس کبھی محل شاہی میں گرفتار ہو کر قتل بھی کر دیئے گئے تھے۔ کیا واقعی ان دنوں پردل راج کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ کیا کسی منچلے شخص نے راجہ کی جان لینے کی کوشش کی تھی جس کی بنا پر پرتاب رودرا رات کے وقت ہر آہٹ پر خنجر بکف مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتا تھا، یا یہ قتل پرتاب رودرا کی سازش کا نتیجہ تھا کہ وہ فی الحقیقت باپ کی موت کا منتظر تھا اور کسی نہ کسی طرح خود راجہ بننے کا حیلہ تلاش کر رہا تھا۔ مختصر یہ کہ ان سوالات کی بنا پر یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے بہت بڑی حد تک محتاج تنقیح و تصحیح ہے۔ ہم پرتاب رودرا کی نیت کے متعلق حسن ظن رکھتے ہیں اور ہمارا یقین ہے کہ نسر در پرتاب رودرا نے جاسوس ہونے کے دھوکہ میں اپنے باپ پر تلوار کا وار کیا ہوگا اور اس سے پرتاب کا مقصد اپنے باپ کے دشمنوں کو تہ تیغ کرنا ہوگا نہ کہ خود اپنے پدر محترم کو قید حیات سے نجات دلانا۔ بہر حال بلند اقبال باپ پردل راج کے خوش نصیب فرزند پرتاب رودرا نے جب عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اس کی اولوالعزمی نے اس کو اپنی قوت کے مظاہرہ کے لئے مجبور کیا۔

تخت نشین ہونے کے ساتھ ہی پرتاب رودرا نے کثو۔کشائی کے منصوبہ کو پورا کرنا شروع کردیا تیلپا نامی مشرقی چالوکیہ خاندان کے راجہ والئ کرناٹک کے انتقال کے بعد اس کا بھائی بھیما تخت نشین ہوا چونکہ اس بدنصیب شخص نے اپنے بھائی تیلپا کو زہر دے کر مار ڈالا تھا۔ اس لئے پرتاب رودرا کو جب اس واقعہ فاجعہ کی خبر ملی تو مارے غصہ کے بیتاب ہوگیا اور اپنے زیر سیادت حلیف تیلپا کے حسرت ناک انجام کا بدلہ لینے کے لئے بھیما کے علاقہ پر چڑھائی کی اور ایک خوں ریز جنگ کے بعد بھیما کو شکست فاش دی بھیما تو خود فرار ہوگیا لیکن کرناٹک کا زرخیز علاقہ پرتاب رودرا کے قبضہ میں آگیا پھر شمال مغربی چالوکیہ خاندان کے راجہ ویرجولا یا ویرودا چولا کے سپہ سالار میڈا ماریا کو پرتاب رودرا نے شکست دی اس شکست نے مغربی چالوکیہ خاندان کی عظمت کا خاتمہ کردیا اس کے بعد پرتاب رودرا نے راجہ کنڈور[1] پر چڑھائی کی اور اس کو بھی اپنا باجگزار بنایا۔ اس کے بعد پرتاب رودرا نے اپنی مشہور و معروف تاخت ریاست کنک کلیان پر کی کنک کلیان راجہ نے بھی پرتاب کی تیغ زنی کے مقابلہ میں اپنی بے لبسی محسوس کرکے علاقہ کلیان کو پرتاب کے حوالہ کردیا لیکن یہی علاقہ کنک ہمیشہ شاہانہ استبداد کی آماجگاہ بنا رہا جس کے نتائج زمانہ مستقبل میں نہایت ہی خطرناک ثابت ہوئے جن کا مفصل ذکر آگے بیان کیا جائے گا۔

پرتاب رودرا نے اپنی عالی ہمتی سے کام لے کر اپنی ریاست کو سلطنت میں بدل دیا اور راجگان تلنگانہ کا مہاراجہ بن گیا پرتاب رودرا اپنے مذہب کا بڑا پابند تھا اس نے اپنے زمانہ میں شیو کے بہت سے مندر تعمیر کئے اور شیو مت کو

---

[1] موجودہ علاقہ گنٹور احاطہ مدراس۔

بڑی ترقی دی اس کے زمانہ میں ورنگل آندھرا تہذیب کا مرکز بن گیا اور جنوبی ہند کی تجارتی منڈی قرار پایا، صنعت و حرفت کی ترقی نے شہر ورنگل کی عظمت میں چار چاند لگا دیے اس کے زمانہ میں رعایا کی خوش حالی میں بہت اضافہ ہوا۔ رعایا کی فارغ البالی نے سلطنت ورنگل کی مالی عظمت کی بنیاد ڈالی یہ عالمگیر خوش حالی پرتاب رودرا کی رعایا پروری عدل و انصاف اور غیر معمولی سیاست و تدبر کا نتیجہ تھی پرتاب رودرا نے ۱۱۹۶ء میں انتقال کیا اس کی مدت حکومت (۵۶) سال تھی۔

مہادیوراج ۱۱۹۶ء تا ۱۱۹۹ء مہادیوراج نے اپنے اقبال مند بھائی پرتاب رودرا اول کو خفیہ طور پر قتل کرا دیا گویا اس نے قدیم روایت کو پھر تازہ کیا۔ یہ راجہ ۱۱۹۶ء میں تخت نشین ہوا لیکن بھائی کا قتل اس کے حق میں نامسعود ثابت ہوا تین سال تک اس کا دور حکومت نہایت ہی بدمزگی سے گذرا کیونکہ رعایا اس کی اس مذموم حرکت سے سخت نالاں تھی بالآخر اس نے اپنی رعایا کا دل خوش کرنے کے لئے کشورستانی کا ارادہ کیا اور ۱۱۹۹ء میں علاقہ دیوگڑھ (دولت آباد) پر حملہ کیا فوج کی بددلی فوراً رنگ لائی اور وہ بڑی بیدردی سے جنگ میں مارا گیا اس طرح سے اس راجہ مہادیوراج کے ناخواستہ اور تکلیف دہ دور کا خاتمہ ہو گیا۔

گنپتی دیوراج ۱۱۹۹ء تا ۱۲۶۰ء گنپتی دیوراج، پرتاب رودرا اول کا متبنٰی بیٹا تھا۔ مہادیوراج کے مرنے کے بعد ۱۱۹۹ء میں تخت نشین ہوا اور اپنے پیش رو مہادیو کے خون کا بدلہ لینے کے لئے دیوگڑھ پر چڑھائی کی ایک جنگ عظیم کے بعد دیوگڈھی کے یادو خاندان کے راجہ نے عاجز آ کر بہت سے نذرانے اور تحائف پیش کئے اور صلح کر لی۔ اس نے راجگان کنگ کلیان کی بغاوتوں کو فرو کیا اور ہر طرف سرکشوں کی

کاملِ سرکوبی کی اسی زمانہ میں ضلع نلور کے ایک چھوٹے رئیس منو ما سدھی نامی کو اکنا اور بتنا نامی دو دعویدارانِ سلطنت نے مل کر تخت سے اتار دیا۔ اس رئیس کا درباری پنڈت تکنا سومیا جی تھا جو خدمتِ وزارت کو بھی انجام دیتا تھا اپنے راجہ کے معزول ہونے کے بعد گنپتی دیوراج کے پاس بغرضِ امدادطلبی چلا آیا تھا راجہ نے اس پنڈت کی بڑی قدر کی اور اس کی حسبِ خواہش ایک فوجِ کثیر سے نلور پر حملہ کر کے اصلی وارث منو ما سدھی کو دوبارہ تخت و تاج واپس دلا دیا۔ تکنا سومیا جی ایک مشہور شاعر اور پنڈت گذرا ہے جس نے والمیکی رامائن کو سنسکرت سے اعلیٰ درجہ کی شستہ تلنگی میں پہلی مرتبہ ترجمہ کیا اور مہابھارت کے (۱۵) باب ترجمہ کر کے تلنگی ادب میں بہترین اضافہ کیا۔ تکنا سومیا جی کا باپ گنٹور کا کوتوال تھا اس خاندان کے لوگ نلور کے قریب اس وقت پٹواری ہیں۔ گنپتی دیوراج نے فاضل پنڈت تکنا سومیا جی کی دادخواہی اور بروقت دستگیری کر کے ایک عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔ اکثر کتبوں میں گنپتی دیوراج کے ساتھ پرناری سہودرا کا لقب موجود ہے جس کے معنی برادرِ نسواں کے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گنپتی دیوراج بڑا ہی نیک چلن پاک طینت اور خداترس راجہ گذرا ہے۔ اس راجہ نے اپنے عہد میں کئی مشہور تالاب بنوائے چنانچہ پاکھال کا تالاب اور رامپا کا تالاب اسی راجہ کے زمانہ میں تیار ہوئے اور رامپا کا مندر بھی اسی کے عہد میں تیار ہوا۔ موضع گھن پور جہاں اب ریلوے اسٹیشن بھی ہے اسی کے زمانہ کا آباد کیا ہوا ہے۔ ہمنت گری ناتھ کا دیول جو ہنمکنڈہ کے پہاڑ پر ہے اور جہاں پانی کا ایک چشمہ بھی موجود ہے ایک رشی کی ہدایت کے بموجب اسی کے عہد میں تعمیر ہوا ہے۔

جینیوں اور بدھوں پر مظالم | گنپتی دیوراج کا رجحان شیومت کی طرف زیادہ تھا اور جین مت سے اُس کو سخت نفرت تھی۔ اس زمانہ میں اُس کی سلطنت میں بہت سے جین آباد تھے چنانچہ ان کے وقت کی بنائی ہوئی مورتیں اور کتبے ہنوز ہنمکنڈہ کے پہاڑ پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ فرقہ ترقی پذیر حالت میں تھا شیومت والے ان کی اس ترقی کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے چونکہ راجہ کا رجحان شیومت کی جانب زیادہ تھا اور جین مت سے اس کو سخت نفرت تھی اس لئے شیومت کے پیرو برہمنوں نے جینیوں کا استیصال کرنے کی کامیاب کوشش کی اور راجہ کی جینیوں سے عداوت سے فائدہ اُٹھا کر اُن کے چھتیس گاؤں مسمار اور برباد کرڈالے جن میں سے ایک کلپیاک بھی تھا۔ یہ بیچارے جین اقوام کے مصائب میں مبتلا ہوئے اکثر تو قتل کردیے گئے اور باقی جلاوطن کردیے گئے ان کے دیول منہدم و تودہ خاک کردیے گئے چنانچہ اب تک ہنمکنڈہ کے اطراف میں اکثر لنگ کے پتھر صاف اور مجلیٰ حالت میں نظر آتے ہیں اور اس زمانہ کی خانہ بربادی کی یاد تازہ کرتے ہیں جین شمالی ہند سے چندرگپت یا جیت کے دور میں قحط سالی کی بنا پر پریشان ہوکر نقل وطن کرکے ملک کرناٹک میں داخل ہوکر آباد ہوگئے تھے ان کی علاقہ تلنگانہ میں کثیر آبادیاں تھیں کہتے ہیں کہ تِکنا سومیاجی پنڈت بھی اس خونریزی کا ایک بڑی حد تک بانی تھا اور گمان غالب یہ ہے کہ گنپتی دیوراج اور اُس کے نواسہ پرتاب رودر ثانی کے عہد میں جو متعصبانہ ظلم جین مذہب والوں پر روا رکھے گئے اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جین لوگ راجہ گنپت دیوراج کے مخالف اور اس کے جانشینوں کے دور میں مسلمانوں کے موید ہوگئے اور یہی ناروا مظالم خاندان کاکتیہ کے زوال کا باعث ہوئے۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ بدھ اور جین مذہب کے زوال کے باعث برہمنی مذہب کے پیرو ہوئے ہیں۔ برہمنی مذہب بھینٹ اور قربانی کو نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا اور اس نے ذات پات کی تقسیم کرکے قومیت کے تخیل کو بالکل پارہ پارہ کردیا تھا لیکن اس کے مقابلہ میں بدھ مت اور جین مت کے حامی نفس کشی اور لذائذ دنیوی سے اجتناب انسانی نجات کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے ان کے مذہب سے ذات پات کی تقسیم مفقود تھی۔ وہ تمام انسانوں کو مساوات کی نعمت سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتے تھے لیکن چونکہ جین مت اور بدھ مت بالکل برہمن مت کی ضد تھے اس لئے جین مت اور بدھ مت کے دور میں برہمنوں کا غیر معمولی تفاخر اور دبدبہ بہت کم ہوگیا برہمنوں کو یہ بات نہایت شاق گزرتی تھی۔ چنانچہ جب کبھی برہمنی مذہب جہاں کہیں بھی جین مت اور بدھ مت پر غالب آیا وہاں اسی قسم کی ہولناک سفاکیوں کا ارتکاب کیا گیا

گنپتی دیو راج کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی صرف ایک لڑکی مسماۃ رودرا دیوی تھی جس کی شادی دنجی[1] راجہ ملہا دیو پلنا چکرورتی سے ہوئی۔ یہ ریاست ۱۲۱۲ء میں سلطنت ورنگل میں ضم ہوگئی کیونکہ اسی سال ملہا دیو پلنا چکرورتی کا انتقال ہوگیا سنہ ۱۲۶۱ء میں گنپتی دیوراج کا انتقال ہوا اس راجہ نے اپنے باپ پرتاب رودرا اول کی شاندار روایات کو تازہ کیا اور برابر سلطنت ورنگل کی عظمت اور شوکت میں اضافہ کرتا رہا اس راجہ کے دور میں رعایا کی خوش حالی میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی، خصوصاً متعدد یادگار زمانہ تالاب بنا کر اس نے بے انتہا زرعی ترقی کی سہولتیں پیدا کردیں اور ورنگل کی تجارتی مرکزیت حسب سابق بحال رہی۔

---

[1] دنجی یا ونگی مشرقی چالوکیہ خاندان کا مستقر تھا

رودرادیوی

سنہ ۱۲۶۱ء میں گنپتی دیوراج کے انتقال کے بعد اس کی نیک بخت بیٹی رودرادیوی نے تخت نشین ہو کر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور چونتیس سال تک کمال دانائی، غیر معمولی تدبر اور محیر العقول شان و شوکت سے حکمرانی کرتی رہی۔ اپنی صلح پسندی اور عدل و انصاف کی بدولت رعایا میں بہت ہر دلعزیز ہو گئی اس رانی نے قلعہ ورنگل کی دوبارہ اس قدر مستحکم تعمیر کرائی کہ کم از کم اس کے دور تک یہ قلعہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا اس رانی کا وزیر باتدبیر ایک شیو برہمن تیوا دیو نامی تھا جس کے حسن انتظام کی بدولت ورنگل بیرونی سیاحوں کے لئے بھی جاذب توجہ اور مرکز سیاحت بن گیا۔ چنانچہ رودرادیوی کے عہد حکومت میں وینس کے مشہور سیاح مارکو پولو نامی نے سلطنت ورنگل کا دورہ کیا تھا۔ اس نے اپنے سفر نامہ میں ورنگل کے طرز حکومت اور انتظام کے متعلق جو حالات لکھے ہیں ان سے پتہ ثابت ہوگا کہ رودرادیوی نے کمال دانشمندی سے کس طرح حکومت کی۔ مارکو پولو کہتا ہے کہ ملک بلہار کے شمال میں ایک ہزار میل کے فاصلہ پر مٹیفل کی سلطنت ہے (مٹیفل کو اب مٹھواڑہ کہتے ہیں) اس ملک پر پہلے ایک راجہ حکمراں تھا اس کی وفات (جسے تقریباً چالیس سال کا عرصہ گزرا) کے بعد سے ایک مشہور زیرک اور عقلمند عورت تھی بڑی شان و شوکت سے حکمرانی کرتی رہی ہے اس رانی کو اپنے شوہر[1] کے ساتھ اس قدر الفت اور محبت تھی کہ اس کی وفات پر اس نے اور کسی سے شادی نہیں کی اور دوبارہ عقد کرنا محبت و مروت کے خلاف جانا اس نے اپنے چالیس سالہ حکومت کے دور کو اس خوش اسلوبی اور عمدگی سے گزارا کہ اس معاملہ میں وہ اپنے شوہر سے بھی سبقت لے گئی۔ اس ملک میں عمدہ قسم کے

---

[1] مارکو پولو نے غلطی سے رودرادیوی کو گنپتی دیوراج کی بجائے دختر کے زوجہ فرض کر لیا ہے۔

ہین کپڑے مثل کڑی کے جالے کے تیار ہوتے ہیں دنیا میں کوئی راجہ یا رانی نہ ہو گی جو ان کو پہن کر خوش نہ ہوتی ہو۔ اس رانی نے اپنے عہد حکومت میں تعلقہ پرکال میں رنبادیبی کے نام سے ایک گاؤں آباد کرایا اور اس کا نام ربالیہ رکھا تھا جو کثرت استعمال سے اب رنبال کہلاتا ہے۔ موضع نرسی کنڈہ بھی اسی رانی کا بسایا ہوا ہے۔

رودرادیوی اخیر زمانہ حکومت میں بہت بوڑھی ہو گئی تھی مسلمانوں کی یورش کا شہرہ ورنگل تک ہو چکا تھا اور شمالی ہند میں مسلمانوں کی ترکتازیوں سے جنوبی ہند کے راجہ مہاراجہ بھی چونک گئے تھے ایسے نازک وقت میں ورنگل کے تخت پر ایک زبردست حکمراں کی ضرورت تھی چونکہ رودرادیوی کا اقبال مند نواسہ پرتاب رودرا ثانی سن شعور کو پہنچ چکا تھا لہذا اس نے کمال دور اندیشی سے کام لے کر سنہ ۱۲۹۵ء میں عنانِ حکومت اس کے سپرد کر دی اور آپ خانہ نشین ہو کر تقریباً سو سال کی عمر طبعی کو پہونچ کر سنہ ۱۳۲۳ء میں انتقال کیا رودرادیوی کا شمار دکن کی مشہور و معروف رانیوں میں ہوتا ہے لیکن سخت حیرت ہے کہ اس رانی کی عظمت کا دکن کی تاریخوں میں بہت کم اظہار کیا گیا ہے مسلمانوں کی دکن میں آمد سے قبل اس رانی کا دور حکومت یقیناً تاریخ دکن کا ایک شاندار باب تھا۔ اگرچہ چاند سلطانہ کے کارنامے نظام شاہی خاندان کے لئے باعث فخر ہیں تو یقیناً رودرادیوی کے کارنامے خاندان کاکیتہ کے لئے بھی باعث فخر و مباہات ہیں۔ قرائن سے ظاہر ہے کہ رودرادیوی کے عہد میں صنعت پارچہ بافی انتہائے کمال کو پہنچ چکی تھی اور ورنگل یقیناً اس کے دور میں موجودہ زمانہ کے یورپول اور مانچسٹر کی ہمسری کا مدعی تھا۔ یہ صنعتی ترقی اس کے پر امن دور کا بین ثبوت سمجھی جاسکتی ہے

پرتاب رودرا ثانی سنہ ۱۲۹۵ء میں تخت نشین

پرتاب رودرا ثانی (سنہ ۱۲۹۵ء تا سنہ ۱۳۲۸ء)

ہوا۔ یہ بڑا شجاع جوانمرد اور جملہ علوم وفنون میں یگانہ روزگار تھا۔ اس راجہ نے تخت پر متمکن ہوتے ہی اطراف وجوانب کے خود مختار راجاؤں پر پیہم یورشیں شروع کر دیں اور اپنی جرار فوجوں سے تمام نیم خود مختار راجاؤں کو مغلوب کر لیا اور اس طرح سے اپنی جہانگیریت کی حکمت عملی کو اختتام تک پہونچایا اس کے عہد میں جین مذہب کے پیرو بری طرح پامال جور وستم ہوئے۔ یہ خود سنسکرت کا بڑا ادیب تھا پرتاب مارتنڈا نامی سنسکرت کتاب کا یہی مصنف ہے اس نے اپنی فوج میں ویلما اور ریڈی فرقہ کے لوگوں کو بڑی بڑی خدمات پر مامور کر کے ان کے دلوں میں شجاعت اور مردانگی پیدا کر دی۔ بمقام پاکھال اس کی ملاقات ایک رشی سے ہوئی اور اس کے حسب ایما وہاں ایک قلعہ پرتاب گڈھ تعمیر کر کے اس جگہ پاکھال پٹم نامی شہر آباد کرایا جس کے کھنڈر آج تک موجود ہیں اس کے علاوہ اس نے موضع پالم پیٹہ میں ایک عالیشان اور قابل دید مندر رامپا کی توسیع کرائی اور اس مندر کی پوجا پاٹ کے لئے چالیس گاؤں عطا کئے گئے اسی راجہ کے عہد حکومت میں مسلمانوں کی یورشیں دکن پر سب سے پہلی مرتبہ شروع ہوئیں سب سے پہلے دیوگڈھ کے راجہ پر سلطان جلال الدین کے بھتیجے علاء الدین نے اپنے ہندو مشیروں کے مشورہ سے جو بھیلسہ کے رہنے والے تھے ایلچپور فتح کرنے کے بعد حملہ کیا اور ۱۲۹۴ء میں دیوگڈھ کو پوری طرح فتح کر لیا تو راجہ رام دیو نے قلعہ بند ہو کر جنگ کرنی چاہی لیکن راجہ رام دیو کے بڑے لڑکے نے اپنے باپ کو محصور حالت میں دیکھ کر ایک لشکر جرار اطراف وجوانب کے راجاؤں سے مدد لے کر تیار کر لیا۔ بہر حال راجہ رام دیو کے بڑے بیٹے کی یہ بڑی ہی بدقسمتی تھی کہ باوجود بیس ہزار فوج فراہم کرنے کے وہ علاء الدین کی چھ ہزار فوج پر غالب

نہ آسکا اور جب ایک گھمسان لڑائی کے بعد علاؤالدین نے راجہ رام دیو کو شکست فاش دی
تو یقیناً تمام راجگان دکن میں اس شکست سے ایک تہلکہ پڑ گیا۔ علاؤالدین نے مال غنیمت
میں بے شمار سونا چاندی موتی اور جواہرات حاصل کئے اور راجہ رام دیو نے ایلچپور کا
علاقہ دے کر صلح کر لی چونکہ علاؤالدین کی دکن پر یہ سب سے پہلی مہم تھی اس لئے وہ
اپنی غیر معمولی کامیابی پر بیحد نازاں تھا دیوگڈھ کی مہم نے تاریخ دکن پر نہایت گہرا اثر
ڈالا اور یقیناً یہ کامیاب مہم آیندہ فتوحات دکن کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ علاؤالدین کو
حصول سلطنت میں دکن کی مشہور تاخت دیوگڈھ کے مال غنیمت نے بیحد مدد دی اور
اسی زر و مال کی بدولت وہ اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے میں کامیاب ہوگیا اس
اس لئے دیوگڈھ کی فتح سے دو نہایت ہی اہم نتائج برآمد ہوئے۔ ایک تو یہ کہ راجگان
دکن کی فوجی طاقت کی کمزوری کا علم مسلمانوں کو ہوگیا دوسرے دکن کے راجاؤں
کے غیر معمولی تمول نے مسلمانوں کے دل سے دکن کی طرف سے غفلت برتنے کے
خیال کو بالکل دور کر دیا۔ اگرچہ یہ ایک اتفاقی بات ہے کہ علاؤالدین نے دیوگڈھ پر چڑھائی
کی اور کامیاب ہوگیا لیکن یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے نہایت ہی نتیجہ خیز ثابت ہوا تھا
کیونکہ دکن میں کامیاب یورش کے خیال نے سلاطین دہلی کو دکن کے مختلف راجاؤں
کے علاقوں کو فتح کرنے کے لئے آمادہ و مستعد کر دیا جس وقت علاؤالدین ۱۲۹۶ء میں سلطنت
دہلی کا مالک ہوگیا اور اسی سال بڑی دھوم دھام سے اس کی تخت نشینی کی رسم ادا
کی گئی تو اس نے پہلے پہل پورے شمالی ہند پر قابض ہونے کی کامیاب کوشش
کی اور اسی لئے ۱۳۰۲ء تک مہمات دکن کی طرف متوجہ نہ ہوسکا۔ علاؤالدین کے
دوسری مرتبہ دکن پر حملہ کی وجہ یہ ہوئی کہ دیوگڈھ کے راجہ رام دیو نے کوئی خراج وغیرہ

نہیں بھیجا اور سچ یہ ہے کہ اگر علاؤالدین دہلی کا بادشاہ نہ ہوتا تو رام دیو سے اتنی دور دکن میں آکر کون بازپرس کرتا۔ مگر جب تقدیر نے دہلی کا بادشاہ اُسی کو بنایا جس نے سب سے پہلے دکن پر چڑھائی کی تھی تو پھر کہنا چاہئے کہ پورے ہندوستان کی سلطنت کا دیوگری سے ایک تعلق ہو گیا۔ چنانچہ جب شمالی ہند میں اس نے مغلوں کے حملوں کو کامیاب طور پر پسپا کر دیا تو پھر ایک فوج ملک کافور کی ماتحتی میں دیوگڈھ پر حملہ کرنے کے لئے سنہ ۱۳۰۶ء میں روانہ کی، رام دیو ملک کافور کے پاس فوراً حاضر ہو گیا، ملک کافور کے لشکر کو اپنا مہمان رکھا اور خدمت گذاری میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ ہونے دیا۔ ملک کافور رام دیو کو اپنے ساتھ دہلی لے آیا اور سلطان علاؤالدین کے سامنے پیش کیا، علاؤالدین نے راجہ کی بہت خاطرداری کی۔ اپنے پاس بہت دنوں تک مہمان رکھا، رائے رایان کا خطاب دیا اور خوب انعام و اکرام سے سرفراز کیا پھر دیوگری کا راجہ بنا کر دکن واپس کر دیا۔ اس کے بعد راجہ رام دیو عمر بھر سلطان علاؤالدین کا فرمانبردار رہا۔

ان حالات سے ورنگل کا راجہ پرتاب رودر ثانی غافل نہ تھا وہ برابر مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے جنگی تیاریاں کر رہا تھا اور اپنی فوجوں کی از سر نو تنظیم شروع کر دی تھی۔ ملک کافور بھی پرتاب رودر ثانی کی جنگی تیاریوں سے پوری طرح واقف تھا۔ اور اس کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ سلطنت ورنگل کا وجود تخت دہلی کے باجگذار دکھنی راجاؤں کے حق میں بغاوت اور سرکشی کا موجب ہوگا اس لئے کہ پرتاب رودر کی حکمت عملی کا مقصد دیوگڈھ کی ریاست کو قدرتی طور پر طاقتور حالت میں دیکھنا تھا کیونکہ اس ریاست کی اطاعت

در حقیقت پرتاپ رودرا کی اطاعت کا پیش خیمہ تھی اگر راجہ رام دیو نے سلطان علاؤالدین
کو بروقت خراج ادا کرنے میں تساہل کا اظہار کیا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس تغافل
پر راجہ پرتاپ رودرا کی ہمت افزائی کی اور آئندہ پرتاپ رودرا کا دیوگڈھ کے راجہ
کو جانی والی۔ دو دینا اور اس کو طاقتور بنانا سیاسی مصلحت کا عین مقصد و منشاء تھا ان
ناگزیر حالات کے تحت ملک کافور کو ورنگل کے راجہ پرتاپ رودرا کو اس کی سرکشی
اور ریشہ دوانیوں کی سزا دینے کے لئے ملک تلنگانہ کی جانب بڑھنا ایک بالکل
حق بجانب امر تھا۔ کیونکہ قانون سیاست میں دشمن اور باغی کی مدد کرنے والا بھی
دشمن اور باغی ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کافور نے سلطنت ورنگل کو
منسوب کرنا دکن کے جاگیرداروں کو مطیع و فرمانبردار کرنے کے مماثل خیال کیا۔ اور
حملہ کی منظوری بھی حاصل کر لی۔

ملک کافور کے ورنگل پر حملہ کی ایک تفصیلی وجہ بیان کر دی گئی اب دوسری
وجہ بھی تفصیل کے ساتھ بیان کی جاتی ہے ارکا دیوراج کے زمانہ سے لیکر پرتاپ رودرا
ثانی کے دور تک کلیان کا علاقہ ہمیشہ راجگان ورنگل کے حملوں کا مرکز بنا رہا اس
کی وجہ شاید یہ ہو کہ سب سے پہلے مہادیو دوربانی خاندان کاکتیہ کے باپ سوبا دیوراج
والی قندھار کو کنک پایہ تخت ریاست کلیان کے راجہ ملہادیو نے عین میدان کارزار
میں قتل کر دیا اور اس طرح سے ہمیشہ کے لئے خاندان کاکتیہ کی دشمنی مول لی بہر حال
اگر ملہادیو نے اپنی فتوحات کے جوش میں قندھار کا علاقہ فتح کر لیا تو اس کے بدلہ میں
ورنگل کے تقریباً ہر ایک راجہ نے اپنے زمانہ حکومت میں کنک یعنی شہر کلیان
پر چڑھائی کی اور اپنے بے پناہ حملوں سے کلیان کے راجہ اور اس کے باشندوں

کے دلوں میں دشمنی اور تنفر کی تخم ریزی کردی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب ملک کافور نے علاقہ کلیان کے راجہ کو مغلوب ومطیع کر لیا تو اس نے پرتاب رودرا ثانی سے اپنی پہلی دشمنی کا بدلہ لینے کے لئے ورنگل پر حملہ کرنے کے لئے ترغیب دی جس سے علاء الدین بے حد متاثر ہوا۔ اور جب اس کو ملک کافور کی عرضداشت ورنگل پر ناگزیر مجبوریوں کی بناء پر حملہ کرنے کی منظوری حاصل کرنے کے لئے وصول ہوئی تو علاء الدین نے بھی بہت کچھ غور وفکر کے بعد حملہ کی منظوری دیدی۔ ابتداء میں ایک فوجی مہم ۱۳۰۶ء میں شاہی سرداروں کی ماتحتی میں ورنگل پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کی گئی لیکن پرتاب رودرا کی جرار فوجوں نے اس فوجی مہم کا بروقت خاتمہ کر دیا اور کم از کم ملک کافور کو یہ محسوس کرنا پڑا کہ پرتاب رودرا کو مغلوب کرنے کے لئے غیر معمولی فوجی تیاریوں کی ضرورت ہے چنانچہ ۱۳۰۹ء میں غیر معمولی اہتمام کے ساتھ ایک جرار فوج ملک کافور کی ماتحتی میں ورنگل کی جانب روانہ کی گئی۔ راجہ رام دیو بطریق متابعت لشکر دہلی کے ہمراہ کئی منزل تک آیا اور ملک کافور سے اجازت لے کر واپس ہوا۔

ملک کافور نے سب سے پہلے نانڈیڑ۔ اندور۔ بودھن (نظام آباد) اور میدک کے قلعوں کو فتح کیا اور یلغار کرتا ہنمکنڈہ کے سامنے پہونچ گیا چونکہ اس جرار فوج کا مقابلہ کرنے کی راجہ کو ہمت نہ ہوئی اس لئے اطراف وجوانب کے راجہ اور والیان ممالک پناہ لینے کے لئے قلعہ ورنگل میں پرتاب رودرا کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے ملک کافور نے سب سے پہلے شہر ہنمکنڈہ پر قبضہ کر لیا اور باقاعدہ ہنمکنڈہ کو اپنا فوجی مستقر بنا کر قلعہ ورنگل پر پیہم حملے شروع کر دیئے قلعہ ورنگل کے مغربی میدان میں ایک خونریز جنگ کے بعد پرتاب رودرا کی فوجیں شکست کھا کر بری طرح پسپا ہوئیں

اور قلعہ ورنگل میں پناہ گزیں ہوئیں۔ اب باقاعدہ قلعہ بند لڑائی شروع ہو گئی جو تقریب ایک ماہ تک جاری رہی۔ بالآخر جب بیرونی قلعہ ملک کافور نے فتح کر لیا تو راجہ پرتاب رودرا نے بھی ہمت ہار دی اور دانائی سے کام لے کر باجگذاری کا وعدہ کرکے صلح کر لی اور بطور نذرانہ شاہی تین سو ہاتھی سات ہزار گھوڑے نے بہت سا سونا چاندی اور بہت سے تحفے علاؤالدین کی خدمت میں ملک کافور کے ذریعہ روانہ کئے چونکہ علاؤالدین نے ملک کافور کو اس امر کی سخت تاکید کی تھی کہ اگر پرتاب رودر سالانہ خراج پابندی کے ساتھ ادا کرنے کا وعدہ کرے تو ہرگز ہرگز سلطنت ورنگل کی کامل فتح کا ارادہ نہ کرنا اس لئے ملک کافور پرتاب رودرا سے خراج گزاری کا وعدہ لے کر فوراً دہلی روانہ ہوگیا۔ اور سارا مال غنیمت علاؤالدین کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جو اس کی اس غیر معمولی کارگذاری سے بیحد خوش ہوا۔

ملک کافور کی اس کامیاب مہم نے اس میں کوئی شک نہیں سلطنت ورنگل کی سیاسی اہمیت کو دربار دہلی کی نظروں میں بہت بڑی حد تک گھٹا دیا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا سخت غلطی ہے کہ پرتاب رودرا کی عظمت اور اس کے اقتدار کا خاتمہ ہوگیا بلکہ اس کے برعکس پرتاب رودرا نے کمال دانائی سے خراج کا وعدہ کرکے اپنی سلطنت کو بالکل تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا۔ اس کی سلطنت اسی کے قبضہ میں رہی اور اس کی ظاہری شان و شوکت میں کوئی فرق نہ آیا ۱۳۱۱ء میں رام دیو کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے شنکر دیو نے بغاوت کر دی مگر پرتاب رودرا ثانی نے یکمشت تین سال کا خراج ادا کر دیا، اور اس طرح اپنی وقعت اور اعزاز کو قائم رکھ کر ملک کافور کو بدگمانی کا ذرا بھی موقع نہ دیا۔

علاؤالدین کے انتقال کے بعد ۱۳۱۷ء میں سلطان قطب الدین مبارک خلجی نے پھر دیوگری پر حملہ کیا کیونکہ ہرپال دیو داماد رام دیو نے تمام راجگان دکن کے اتحاد سے شاہی عاملوں کو دکن سے نکال دیا تھا۔ یہ حقیقت میں ایک گہری سازش تھی لیکن دہلی کی جرار فوجوں نے بہت جلد اس سازش کا خاتمہ کر دیا۔ پرتاب رودرا کے متعلق بھی اس سازش میں شرکت کا گمان کیا گیا لیکن اس نے بروقت خراج ادا کر کے سلطنت ورنگل کو عتاب شاہی سے بچا لیا۔ خاندان خلجی کے خاتمہ پر ۱۳۲۱ء میں جب غیاث الدین غازی ملک تغلق نے تخت دہلی پر قدم رکھا اور دیوگڈھ میں بھی بدنظمی اور ابتری کی خبر ملی تو اُس نے اپنے بیٹے جونا خان المعروف بہ الغ خان کو لشکر جرار کے ساتھ دکن کی مہم پر ۱۳۲۳ء میں روانہ کیا۔ بدقسمتی سے پرتاب رودرا نے اسی وقت خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ملک کافور اور سلطان علاؤالدین کی وفات سے راجگان ورنگل کے دلوں سے سلطنت دہلی کا رعب و داب بالکل زائل ہو گیا ہو اور شاید انھوں نے یہ سمجھ لیا ہو کہ اب علاؤالدین ثانی پیدا نہ ہو گا لیکن یہ پرتاب رودرا کی بہت بڑی غلطی تھی کیونکہ غازی ملک تغلق بحیثیت مدبر اور سپہ سالار کسی طرح علاؤالدین سے کم نہ تھا بلکہ علم و فضل کے اعتبار سے غازی ملک کو سلطان علاؤالدین خلجی پر ہر طرح سے فضیلت حاصل تھی۔ غازی ملک نے تخت نشین ہوتے ہی عہد علائی کے تمام کھوئے ہوئے علاقوں کو یکے بعد دیگرے حاصل کرنا شروع کیا اسی سلسلہ میں وہ دیوگڈھ کی از سر نو تسخیر کے لئے بیچین تھا۔ چنانچہ اس نے ملک برہان الدین کو دیوگڈھ کا عامل مقرر کر کے دکن کی جانب روانہ کیا لیکن خاندان علائی کی بربادی کے بعد اس عام بے چینی کو جو دکن میں پیدا ہو چکی تھی ملک برہان الدین

دفع نہ کرسکا اور اسی بے چینی سے فائدہ اٹھا کر پرتاب رودرا نے بھی اپنی فوجی قوت ازسرِنو مستحکم کرکے خراج کی ادائی سے انکار کردیا۔ یہ انکار پرتاب رودرا کے حق میں سخت مضرت رساں ثابت ہوا۔ ولی عہد سلطنت جونا خاں (محمد تغلق) ۱۳۲۲ء میں ایک لشکر جرار کے ساتھ تمام علاقہ تلنگانہ کو مغلوب و مسخر کرتا ہوا ورنگل کے شہر تک پہنچ ہی گیا اور قلعہ ورنگل کا شدید محاصرہ شروع ہوگیا۔ پرتاب رودرا نے بڑی مردانگی اور جرأت کے ساتھ دہلی کی فوج کا ایسی بہادری اور بے جگری سے مقابلہ کیا جس میں گزشتہ شکست اور اطاعت کے داغ رسوائی کو ورنگل کی فوج نے اپنی شجاعت اور پامردی کی بدولت دھو دیا۔ دہلی کے لشکر کو شاید ہی ایسا شدید معرکہ دکن میں پیش آیا ہو۔ بہرحال کئی ماہ تک لڑائی بدستور جاری رہی۔ مگر اس کا کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا اس لئے کہ میدانی فیصلہ کن جنگ میں پرتاب رودرا ثانی نے شکست کھائی اور مجبوراً اس نے اپنی تمام فوج کو قلعہ بند ہوکر لڑنے کا حکم دیا لیکن جب الغ خاں نے سرنگوں اور دمدموں کا انتظام کرلیا اور قریب تھا کہ قلعہ ورنگل کا حصار مفتوح ہوجائے ایسی نازک حالت میں پرتاب رودرا ثانی نے عاجز آکر صلح کی درخواست کی اور حسب سابق سلطانِ دہلی کو خراج روانہ کرنے کا اقرار واثق کیا لیکن شہزادہ الغ خاں محاصرہ کی طوالت اور کثیر اتلاف جان کی وجہ سے سخت برہم تھا اور اس کو سیاسی فریب سمجھ کر اس بات پر تلا ہوا تھا کہ قلعہ ورنگل کو پوری طرح مسخر و مفتوح کرلیا جائے تاکہ آئندہ فتنوں کا دروازہ بند ہوجائے اس لئے شہزادہ الغ خاں نے پرتاب۔ ودرا کی درخواست صلح نامنظور کردی اور غیر معمولی طور پر فوج کو محاصرہ میں شدت اختیار کرنے کا حکم دے دیا پس پوری سرگرمی کے ساتھ قلعہ کا محاصرہ شروع ہوگیا لیکن مشیت ایزدی کچھ اور ہی تھی

بارش کا آغاز ہو چکا تھا لشکر دہلی میں ہیضہ پھوٹ پڑا اور کثیر اموات واقع ہوئیں۔ اس بلائے ناگہانی سے لشکر شاہی میں سخت پریشانی پھیل گئی کثرت بارش کی وجہ سے اتفاقی طور پر دہلی کی ڈاک جو ہر ہفتہ آتی تھی ایک مہینہ تک بند ہو گئی شیخ زادہ دمشقی اور عبید شاعر نے جو الغ خاں کے بہت ہی بارسوخ مصاحبوں میں سے تھے یہ جھوٹی خبر اڑا دی کہ سلطان غیاث الدین تغلق کے فوت ہو جانے سے دہلی میں ایک فتنہ عظیم برپا ہو گیا ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص بادشاہ مقرر ہو چکا ہے۔ ان فتنہ پردازوں نے ایک اور قبیح حرکت یہ کی کہ عہد علائی کے نامی گرامی سرداران فوج۔ ملک تیمور، ملک مل افغان ملک کافور مہردار اور ملک تگین کو یہ مغالطہ دیا کہ شہزادہ الغ خاں ان کے قتل کی فکر میں ہے، کیونکہ یہ امرائے فوج شہزادہ کی قیادت سے سخت ناراض ہیں یہ منگھڑت خبر وحشت اثر سن کر ان تمام امرا نے راہ فرار اختیار کی الغ خاں نے مجبور ہو کر اپنی فوج کو دیوگڈھ واپسی کا حکم دیا۔ اس تائید غیبی سے پرتاب رودرا نے فائدہ اٹھایا اور لشکر دہلی کے منتشر مضطرب اور برگشتہ خیال افراد کو بری طرح گھیر گھیر کے ہلاک کر ڈالا اس عارضی کامیابی سے پرتاب رودرا بیحد خوش تھا مگر قسمت اس کی عارضی مسرت کا مضحکہ اڑا رہی تھی چنانچہ اس واقعہ مراجعت دیوگڈھ کے صرف چار ماہ بعد ہی الغ خاں نے ایک لشکر جرار کے ساتھ دوبارہ ورنگل کی طرف دیوگڈھ سے پیشقدمی کی کیونکہ سلطان غیاث الدین کا یہ سخت حکم وصول ہوا تھا کہ بہرصورت ورنگل کی مہم کو حسن اختتام تک پہونچایا جائے۔ اس لئے شہزادہ الغ خاں نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی اس عاجلانہ اقدام کی سیاسی مصلحت یہ تھی کہ کہیں پرتاب رودرا ثانی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تمام رئیسگان دکن کو متحد نہ کر لے اور مثل ہرپال دیو کے ایک فتنہ عظیم کا باعث نہ ہو جائے

بہر حال شہزادہ الغ خاں نے سب سے پہلے شہر بیدر کا محاصرہ کیا جو اس وقت ملک تلنگانہ کی سرحد پر واقع تھا اور اس کو فتح کرنے کے بعد سیدھا ورنگل کی جانب بڑھا اور ورنگل پہونچ کر شدت سے محاصرہ شروع کر دیا۔ اس اچانک حملہ کی پرتاب رودر تاب نہ لاسکا اور ایک کمزور مقاومت کے بعد یہ مستحکم قلعہ فتح ہو گیا پرتاب رودر ثانی معہ اہل خاندان کے حراست میں لے لیا گیا لیکن اس ہنگامہ دار و گیر میں اکثر خاندان کاکیتیہ کے شہزادے فرار ہو گئے حسرت پرتاب رودر ثانی کے ساتھ اس کا وزیر باتدبیر کنو یا کنیا دہلی روانہ کیے گئے جہاں چھ ماہ کی مسافت طے کرنے کے بعد انھیں صعوبات سفر سے بظاہر آرام نصیب ہوا سلطان غیاث الدین تغلق نے پرتاب رودر ثانی کے ساتھ بجد شریفانہ سلوک کیا اور کامل دو سال قیام کے بعد اس کو وطن واپس جانے کی اجازت مل گئی پرتاب رودر انے کہتے ہیں کہ ۱۳۲۸ء میں نہایت ہی گمنامی کی حالت میں بمقام منتھنی[1] انتقال کیا لیکن اس کا وزیر کنیا دہلی میں ہی مقیم رہا سلطان محمد تغلق کے دور میں کنیا مشرف بہ اسلام ہو کر وزارت کے درجہ تک پہنچ گیا (جو سلطان محمد تغلق کی بے تعصبی کی روشن دلیل ہے) اور سلطان فیروز تغلق کے دور میں خان خاناں کے ممتاز خطاب سے سرفراز ہوا۔

قلعہ ورنگل فتح ہونے پر شہزادہ الغ خاں نے اُس کے فوجی استحکامات کو منہدم کر دیا اور اس کا نام سلطان پور رکھا ۱۳۲۳ء سے ۱۳۴۲ء تک برابر سلطان محمد تغلق کا اس قلعہ پر اور کل ملک تلنگانہ پر قبضہ رہا لیکن جب ۱۳۴۲ء میں ابراہیم حسن والی دکرناٹک) معبر نے بغاوت کی تو تمام دکن کے فتنہ پردازوں کو سرکشی کرنے کا

---

[1] آجکل منتھنی ضلع کریم نگر کا ایک مستقر تعلقہ ہے۔

موقع مل گیا اور اسی بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر کرشنا رائے نے ملک مقبول والیٔ ملنگانہ کو بیدخل کر کے قلعہ ورنگل پر قبضہ کر لیا اور پانچ سال کے قلیل عرصہ میں اپنی فوجی قوت کو خوب بڑھا لیا علاقہ تلنگانہ میں اس حکومت کے بہ آسانی قیام کی غالباً وجہ یہ تھی کہ کرشنا رائے نے اپنے آپ کو پرتاپ رودر ثانی کا فرزند ظاہر کیا چنانچہ ہزاروں آدمی اسی وجہ سے قدیم خاندان شاہی کو دوبارہ برسر اقتدار دیکھنے کے لئے اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے جب ۱۳۴۷ء میں علاؤ الدین حسن گنگو نے بغاوت کی اور سلطنت بہمنی کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی تو اس وقت بھی کرشنا رائے نے علاؤ الدین حسن کی مدد پندرہ ہزار فوج سے کی اور سلطان محمد تغلق کو زک دینے میں اس طرح کرشنا رائے نے علاؤ الدین حسن کا زبردست ساتھ دیا۔ اسی احسان کا بدلہ تھا کہ علاؤ الدین حسن گنگو نے اپنے دور حکومت میں کبھی علاقہ تلنگانہ کو فتح کرنے کا خیال نہ کیا اور ہمیشہ کرشنا رائے یا کرشنا راج کی شرارتوں پر چشم پوشی کرتا رہا بہر حال خاندان کاکیتہ کو اگر ایک مسلم سلطان نے تاراج کر دیا تو دوسرے مسلم سلطان نے ابھرنے کا موقع دیا اور اس طرح اپنی رواداری کا بہترین ثبوت دیا مگر یہ یاد رہے کہ ہمیشہ راجگان ورنگل و بیجانگر سلطنت بہمنی کی بیخ کنی کے درپے رہتے تھے اسی لئے شاہان بہمنی بھی ان راجاؤں سے بدظن رہتے۔ دکن کے راجاؤں کو اکثر راجگان بیجانگر بغاوت اور سرکشی کے لئے ابھارتے رہتے تھے چنانچہ اس سرکشی بغاوت اور عہد شکنی کا راجگان ورنگل کو سخت خمیازہ بھگتنا پڑا علاؤ الدین حسن گنگو کے بعد جب اس کا بیٹا محمد شاہ بہمنی تخت نشین ہوا تو اس وقت بھی ورنگل کے راجہ نے برابر عہد شکنی کی اور شاہی علاقوں پر اس کا بیٹا ناگ دیو چھاپے مارنے لگا بالآخر محمد شاہ نے

تنگ آ کر اس کی سخت سرزنش کی اور ناگ دیو مارا گیا اس کے مارے جانے کا کرشنا راج کو بیحد صدمہ ہوا چنانچہ اس نے سلطان فیروز تغلق کی خدمت میں ایک درخواست بھیجی کہ اگر دکن پر افواج دہلی حملہ آور ہوں تو افواج ورنگل ضرور ان کی مدد کریں گی۔ اس سازش کا بروقت علم ہو گیا اور محمد شاہ نے ورنگل پر چڑھائی کر دی مگر راجہ نے مقابلہ کی تاب نہ لا کر سلطان محمد شاہ بہمنی سے معذرت چاہی اور بطور تاوان جنگ تین سو ہاتھی تین لاکھ ہن اور قلعہ گولکنڈہ سلطان کے حوالہ کر دیا جو زمانہ مابعد میں ایک بہت بڑی ریاست کا مستقر بن گیا۔ راجہ ورنگل نے یہ سوچ کر کہ سلاطین بہمنی سے بجز صلح و آشتی کے کسی اور تدبیر سے ملک کو بچانا سخت دشوار ہے یہ درخواست محمد شاہ بہمنی کی خدمت میں کی کہ اگر سلطان قلعہ گولکنڈہ کو اپنی سرحد شرقی قرار دے اور ایک دوامی پیمان اس تعین سرحد کے متعلق تحریر فرمادے تو وہ ایک تخت بے بہا اس کی نذر کرے گا جو شاہان دہلی کی نذر کے لئے تیار کیا گیا تھا سلطان محمد شاہ نے اس کی درخواست منظور کی چنانچہ وہ تخت فیروزہ جس میں بیش بہا جواہر جڑے ہوئے تھے سلطان کے قبضہ میں آیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۳۷۱ء کا ہے اس کے بعد برابر سنہ ۱۴۲۴ء تک راجگان ورنگل نے سلطنت بہمنی کے خلاف کوئی پریشان کن اقدام نہیں کیا لیکن بدوران حکومت احمد شاہ بہمنی سنہ ۱۴۲۴ء میں ورنگل کے راجہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ ورنگل کے راجہ نے آبائی اتحاد کو بالائے طاق رکھ کر راجہ بیجانگر کی فوجی اور مالی امداد کی جو احمد شاہ بہمنی کا جانی دشمن تھا۔ یہ حرکت احمد شاہ بہمنی کو سخت ناگوار گذری چنانچہ سنہ ۱۴۴۲ء میں ایک جرار فوج کے ساتھ قلعہ ورنگل پر حملہ کر دیا اور سخت گھمسان کی لڑائی کے بعد قلعہ ورنگل فتح ہو گیا۔ ورنگل کا راجہ لڑائی میں مارا گیا اور تمام دولت بطور

مال غنیمت سلطان کے قبضہ میں آگئی تمام علاقہ تلنگانہ پر سلطان کا قبضہ ہو گیا جس کو دو صوبوں میں تقسیم کیا گیا چنانچہ مغربی تلنگانہ کا مستقر ورنگل قرار پایا اور مشرقی تلنگانہ کا مرکز (بشمول موجودہ اضلاع شمالی سرکار) راجمندری قرار پایا اور برابر یہ علاقہ تلنگانہ سلطنت بہمنی کے زوال تک سلاطین بہمنی کے قبضہ میں رہا۔ ورنگل میں اچھی خاصی مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی مستقل طور پر قائم ہو گئی جس نے بعد میں ایک مستقل آبادی کی صورت اختیار کر لی ۱۵۱۸ء تک علاقہ تلنگانہ سلاطین بہمنی کے قبضہ میں رہا۔ چنانچہ اسی سال جب ۱۵۱۸ء میں قطب الملک والی تلنگانہ نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور گولکنڈہ کو اپنا مستقر حکومت قرار دے کر سلطان قلی قطب شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا تو اس وقت علاقہ جات کھمم اور ورنگل شتاب خاں کے قبضہ میں تھے جو بیان کیا جاتا ہے کہ ایک نو مسلم راجہ تھا شتاب خاں نے سلطان قطب شاہ سے چھیڑ شروع کر دی اور سلطان کے علاقہ پر حملہ آور ہوا جو اس وقت موجودہ تعلقہ ورنگل تک پھیلا ہوا تھا جنگ میں شتاب خاں کو سخت شکست ہوئی اور پورا علاقہ ورنگل و کھمم سلطان قطب شاہ کے قبضہ میں آگیا جب ۱۶۸۷ء میں سلطنت قطب شاہیہ کا خاتمہ ہو گیا اور شہنشاہ اورنگ زیب نے کل علاقہ تلنگانہ پر قبضہ کر لیا تو اس وقت ورنگل کا گورنر (صوبہ دار) رستم خاں نامی ایک مدبر شخص مقرر کیا گیا اس طرح سے ۱۷۲۴ء تک علاقہ تلنگانہ دہلی کے شاہان مغلیہ کے ماتحت رہا۔ اور ورنگل برابر مستقر حکومت تسلیم کیا جاتا رہا لیکن اسی سال ۱۷۲۴ء میں جب نظام الملک آصفجاہ اول نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور خاندان آصفی کی بنیاد ڈالی تو اس وقت سے اب تک برابر علاقہ ورنگل ریاست آصفیہ کا ایک اہم صوبہ اور خود شہر ورنگل علاقہ تلنگانہ کا مستقر ہے۔ ورنگل میں اب بھی مسلمانوں کے دور

کی بعض صنعتیں زندہ ہیں۔ یہاں قالین بافی شطرنجی باقی۔ نواڑ بافی اور ریشم سازی کے ماہر موجود ہیں علاوہ ازیں حال ہی میں دباغت کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ ایک پارچہ بافی کی گرنی بنام اعظم جاہی ملز قائم ہوچکی ہے جو علاقہ تلنگانہ کی تن پوشی کی دن بدن اجارہ دار بنتی جارہی ہے۔ آثار قدیمہ میں اب بھی دیول ہزار ستون اور قلعہ ورنگل کے قلب میں شاہی محل کے دروازے اپنی گل کاری اور پچیکاری کے اعتبار سے لاجواب نمونے تصور کئے جاتے ہیں حکومت سرکار عالی نے بذریعہ محکمہ آثار قدیمہ ان "آثار صنادید تلنگ" کو بہتر حالت میں برقرار رکھا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلم دور کی کچھ خصوصیات بیان کی جائیں اور چند معترضین کے جھوٹے اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ عام طور سے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اس خوشحال سلطنت کا خاتمہ کر دیا جو ہندو تہذیب کی علمبردار تھی۔ یہ اعتراض بظاہر جس قدر سیدھا سادا ہے اس سے زیادہ فساد انگیز۔ ملک کافور کا دکن پر حملہ نہ تو سلطنت دہلی کی طرف سے پہلا حملہ تھا اور نہ اُس کا مقصد تبلیغ اسلام تھی۔ اس کی نوعیت بالکل سیاسی تھی ہر زمانہ میں فاتح قوم نے اپنی فتوحات کے دائرہ کو وسیع کرنے، اپنے اقتدار کو مضبوط و مستحکم کرنے، اور اپنی مالی حالت کو درست کرنے کی کوشش کی ہے اس جذبہ کشور کشائی سے راجگان ہند قدیم بھی عاری نہ تھے کیا ملک کافور سے ٹھیک ایک ہزار سال قبل سمدر گپت نے اپنی یلغار سے دکھنی ریاستوں کے خزانوں کا حاکمانہ جائزہ نہ لیا تھا، اور کیا اس کی دکھنی تاخت نے راجگان دکن کو پریشان و مضطرب نہ کر دیا تھا؟ جب اس تاخت پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تو غریب ملک کافور کے حملہ کے سوگ میں کیوں صف ماتم بچھائی جائے، اور کیوں سلطان محمد تغلق اور احمد شاہ بہمنی کو مورد الزام

قرار دیا جائے، جب کہ دنیا میں یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ہر فاتح نے اپنے اقتدار کا مظاہرہ کیا
کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ پرتاب ردر ثانی نے اطراف و جوانب کے کئی راجاؤں کی
آزادی بزور شمشیر سلب کرکے اپنے اقتدار میں اضافہ کیا تھا؟ اگر کیا تھا تو یقیناً اس کو اس امر کا
حق حاصل تھا کہ جہاں تک ہو سکے اپنے جذبہ کشور کشائی کو ترقی دے اور قدیم تاریخی
سنت کی پیروی کرے جب پرتاب ردر ثانی کی عظمت اور شوکت کی بنیاد
ہی اس کی وسیع اور عظیم الشان سلطنت قرار دی جاتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اگر کسی
مسلم حملہ آور نے اسی سنت پر عمل کرکے دکھنی فتوحات سے اپنی سلطنت کی توسیع کی ہو تو اس
کو لائق سب و شتم قرار دیا جائے بہر حال اس پر آشوب دور میں عموماً تاریخ کی غلط تعلیم
ہندوستان کی دو زبردست قوموں میں فساد کی تخم ریزی کر رہی ہے اس لئے ضروری
معلوم ہوا کہ ان تاریخی حقایق کا اظہار کیا جائے۔

یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسلم حکمرانوں نے علاقہ ورنگل پر قابض ہونے
کے بعد قدیم ہندی معاشرت اور رسم و رواج میں مداخلت نہیں کی بلکہ ہندو رعایا کو مکمل آزادی
دی گئی؛ قدیم نظام مالگذاری حسب سابق ہندوؤں کے قبضہ میں ہی رہا، زمیندار، پٹیل
پٹواری حسب سابق ہندو رہے کبھی بھی ان کی دل آزاری اور دل شکنی کو گوارا نہیں کیا گیا
مسلم راج کی خصوصیت علاقہ تلنگانہ میں صلح پسندی رعایا پروری اور سیاسی رواداری
ہی رہی اور آج بھی کامل چھ سو سال گذرنے کے بعد علاقہ تلنگانہ اور خود مستقر ورنگل
کی آبادی زیادہ تر برادران ہنود کی ہی نظر آتی ہے جو نہ صرف آبادی کے اعتبار سے
بڑھے ہوئے ہیں بلکہ دولت و تمول میں بھی مسلمانوں سے بہت آگے نظر آتے ہیں، خود
دلیل اس امر کی ہے کہ ذرائع معیشت کبھی دور اسلامی میں رعایا پر مخدود نہیں کئے گئے

نہ صرف قدیم صنعتوں کی سرپرستی کی گئی بلکہ اُن کی اصلاح کرکے انھیں ایک حیات دوام بھی بخشی گئی صنعت قالین بافی مسلم دور کی ایک اصلاح شدہ صنعتی یادگار ہے جو اب بھی دست بُرد زمانہ سے محفوظ رہ کر اپنی انفرادیت کو بحال رکھے ہوئے مسلم رواداری کا زبان حال سے اعتراف کر رہی ہے اگر مسلم دور کی خوشحالی کا مقابلہ موجودہ صنعتی نسبت سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ورنگل کا صنعتی ماضی حال سے کہیں زیادہ درخشاں تھا۔ مُسلم دور میں کبھی علاقہ تلنگانہ[1] کی غیر مسلم رعایا کو غیر مسلح اور بے ہتھیار نہیں کیا گیا ہر شخص کو اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کا کامل اختیار حاصل تھا اور جب کبھی حکومت وقت کی طرف سے ذرا بھی غفلت یا چشم پوشی کا اظہار ہوتا تو نہ صرف راجگان ورنگل بلکہ معمولی سے معمولی زمینداران علاقہ تلنگانہ بھی بغاوت اور سرکشی پر آمادہ ہوجاتے باوجود اس سرتابی کے جب کبھی سرکوبی کی نوبت آتی تو مسلم حکمراں وقتی طور پر تعزیری قوانین کا نفاذ کرتے اور عام رعایا کی امن پسند زندگی میں جب کبھی کوئی شورش پسند خلل ڈالنے کی کوشش کرتا تو بروقت اس کی شرارت کا سد باب کر دیتے۔ باوجود اس کے کہ علاقہ ورنگل کی رعایا نے نہ صرف سلاطین دہلی بلکہ سلاطین بہمنی و مغلیہ سے بھی عہد شکنی، شورش اور بغاوت کی جس میں طرفین کے ہزاروں آدمی مارے گئے لیکن کبھی اس شورش کا کامل سد باب کرنے کے لئے رعایا کو حفاظت خود اختیاری کے حربہ یعنی تیغ و تفنگ کے استعمال سے محروم نہیں کیا گیا اور نہ نظام حکومت کے اہم عنصر یعنی مقامی پنچایتوں کے قیام اور حکومت خود اختیاری یعنی سوراج کے حقوق سے محروم کیا گیا بہرحال اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو مسلم راج پیام رحمت ہی ثابت ہوگا۔

احمد عبدالعزیز

---

[1] یہاں علاقہ تلنگانہ سے مراد صوبہ آندھرا ہے جو صوبہ مدراس میں زیادہ تر اور ریاست سرکار عالی میں

عہد علائی میں تسخیر ورنگل[۱]

دکن کے راجاؤں کے ساتھ علاؤالدین کی حکمت عملی محض اپنا اقتدار تسلیم کروانا تھا۔ اس نے کسی سلطنت کو ملحق نہ کیا اور بڑی خوبی کے ساتھ اپنی اس حکمت عملی کو کامیاب بنایا تغلق بادشاہوں نے اور ایک زمانہ بعد اکبر نے الحاق کے مسلک پر کام کیا لیکن اس کے اثرات کا لحاظ کرتے ہوئے علاءالدین کا مسلک نہایت ہی بہتر اور دوراندیشانہ تھا۔ ان حملوں کا ایک اور مقصد اخراجات کی تلافی تھا، کیونکہ مغلوں کے حملوں سے ملک کو محفوظ رکھنے کے لئے سرحد پر بڑی فوج رکھی گئی تھی، جس کا بار مرکزی خزانہ پر تھا دیوگڑھ کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد سلطان نے سنہ ۱۳۰۸ء مطابق ۲۵ جمادی الاول سنہ ۷۰۹ھ میں کثیر لشکر کے ساتھ ملک کافور اور ملک حاجی[۲] کو ورنگل[۳] کی فتح کے لئے طلب کیا اور ملک کافور کو چند ہدایات کیں جن سے سلطان کے تدبر و فراست کا اندازہ لگتا ہے:۔

ہدایات

(۱) تم غیر ملک جاتے ہو جو منہ سے کہو اس پر عمل کرو اور وعدہ خلافی سے بچو۔

---

[۱] خزائن الفتوح صفحہ (۹۶) بدایونی سنہ ۷۰۹ صفحہ ۱۹۶

[۲] ملک حاجی نائب عرض الممالک تھے آپ کا خطاب خواجہ نصیر الملک سراج الدولہ تھا خزائن الفتوح صفحہ (۸۹ و ۹۲)

[۳] برنی صفحہ ۳۲۰ ارنگل، طبقات اکبری صفحہ ۷۲ ارنگل۔ ارنگل، خزائن الفتوح صفحہ ۱۲۵

(۲) ماتحتوں کے معمولی جرم سے جہاں تک ہو سکے چشم پوشی کرو۔
(۳) ایسا کوئی کام نہ کرو جس سے فتنہ و فساد برپا ہو۔
(۴) اپنے ملوک اور اُمرا کے ساتھ مناسب اخلاق سے پیش آؤ۔
(۵) جس مہم پہ جاؤ اُس کی نسبت خواجہ حاجی سے مشورہ کرو اور امورِ مملکت میں بھی انھیں سے رائے لو۔
(۶) اپنے طریقۂ کار میں نرمی و گرمی کا توازن برقرار رکھو۔
(۷) ماتحتوں کو مرفہ الحال اور خوش رکھو۔
(۸) قتل و غارت سے حتی الامکان پرہیز کرو۔
(۹) اگر کسی سپاہی کا گھوڑا ضائع ہو جائے تو شاہی اصطبل سے گھوڑا فراہم کرو۔ اور اگر کسی سپاہی کو قرض کی ضرورت ہو تو اُسے پائیگاہ سے دے دو۔
(۱۰) خواجہ سے کہو جتنے گھوڑے بیکار ہو جائیں یا تلف ہو جائیں ان سب کا حساب دفتر میں رکھے جو کار جہانداری کے لئے ضروری ہے[۱]۔

مقام رابری تک خود سلطان فوج کو چھوڑنے کے لئے آیا۔ چندیری میں دیگر مقامات کی فوجیں بھی مرکزی فوج سے مل گئیں[۲]۔ کافور تمام فوج لے کر نو روز کی مسافت طے کرنے کے بعد مسعود پور پہنچا۔ وہاں دو روز قیام کرنے کے بعد روز دوشنبہ ۶ جمادی الآخر کو فوج نے کوچ کیا۔ راستہ بہت ہی ناہموار تھا۔ گڑھوں کی کثرت کے باعث عبور و مرور میں سخت دقت پیش آتی تھی۔ دامن کوہ کی وادیاں پانی

---

[۱] برنی صفحہ ۳۲۸

[۲] دکن کے حملوں میں ملک نائب کے ساتھ امیر خسرو بھی تھے منتخب التواریخ جلد ۱ صفحہ ۱۹۷ و ۲۲۶۔

کے تیز بہاؤ کے باعث صاف نہ تھیں اور بکثرت جھاڑیوں سے پٹی پڑی تھیں جس کے باعث فوج کے ایک دستے کو آگے روانہ کرنا پڑتا تھا جو راستہ صاف کرتا ہوا جاتا تھا۔ یہ دور وسطیٰ کی خصوصیت ہے یعنی جب کبھی ناہموار اور جنگل سے پٹے ہوئے راستوں سے گزرنا پڑتا تو ایک دستہ فوج کا آگے آگے رہتا تھا جس کا کام راستہ صاف کرنا ہوتا تھا۔

چنانچہ سلطان جلال الدین اکبر اور اس کے پہلے حکمرانوں کو بھی فوج کے کوچ کے وقت انہی مشکلات کا سامنا ہوا اور انھوں نے بھی اسی ترکیب پر عمل کیا۔ خود اکبر جب پہلی مرتبہ پنجاب سے کشمیر کی طرف چلا تو اس وقت بھی اس طرح کا ایک دستہ پتھروں اور پہاڑوں کو صاف کر کے راستہ بناتا تھا۔[1]

باوجود ان مصائب و تکالیف کے علائی فوج میں لائق تحسین تنظیم پائی جاتی تھی اور وہ برابر پرے جمائے آگے بڑھ رہی تھی۔ اور کسی سپاہی کی مجال نہ تھی کہ وہ صف سے علیحدہ راستہ اختیار کرتا۔ یہ علاء الدین کے فوجی انتظام کا بین ثبوت ہے مسعود پور سے نکل کر چھ روز کے عرصے میں جون ڈیپل وغیرہ طے کر کے فوج سلطانپور پہنچی جو عرف عام میں ایرچ پور کہلاتا ہے یہاں چار روز قیام رہا۔ ۱۹ جمادی الآخر روز یکشنبہ کو فوج دکن کی طرف بڑھی چونکہ فوج کی اکثریت سواروں پر مشتمل تھی اس لئے بہت تیز چلی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ بار برداری کے جانور مثلاً بیل اور بھینسے بھی تھے جن پر سامان لدا ہوا تھا۔ ہراول آگے آگے بلا کھٹکے

---

[1] ابوالفضل دفتر اول۔ نامہ اکبر بنام شاہ عباس والئی ایران۔

[2] خزائن الفتوح ص ۸۰

چلا جا رہا تھا۔ لشکر میں بے شمار پیادہ بھی تھے جو پھرتی سے سوارہ فوج کا ساتھ دیئے جاتے تھے۔ تیرہ روز کے بعد لشکر سلطانی یکم رجب کو کھانڈا پہنچا۔ حاکم شہر فوج کے استقبال کے لئے آیا اور اس نے فوج کے تمام لوگوں کی تین ماہ کی تنخواہ پیش کردی اور بہت کچھ بطور نذرانہ بھی دیا۔ کھانڈا میں چودہ روز قیام رہا۔ اس عرصے میں تمام فوج کی تنقیح کی گئی۔ یہاں دوران قیام میں سپہ سالار کے شامیانہ میں لشکر کے تمام مذہبی پیشوا، اور معتقد اصحاب، سردار، علما، اور مشاہیر جمع ہوتے تھے۔ انھوں نے ۱۵ رجب کی شب کو سلطان کی ترقی، عمر و دولت اور فتح نصرت کے لیے دعا کی۔

۱۶ رجب کی صبح کو فوج کھانڈا سے نکل کر سرد پور پہنچی۔ اب فوج کو ہر روز ندیاں عبور کرنا پڑتی تھیں۔ جس ندی پر سے فوج گذرتی وہاں کے ندی پار کرانے والوں کو ان کی خدمت کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ فوج کے ساتھ ساتھ چوپائے بھی تھے۔ جو فوج کا سامان اٹھائے ہوئے پیچھے پیچھے تیرتے آتے تھے۔ بالآخر لشکر دریائے نربدا پہنچا۔ اس وقت دریا بھرا ہوا بہہ رہا تھا۔ لیکن انتظامات کی خوبی کے باعث تمام فوج مع سامان سلامتی کے ساتھ دریا پار ہوگئی۔ غرض اس طرح آٹھ روز سفر کرنے کے بعد شاہی فوج نیل کنٹھ پہنچی جو دیوگیر کی سرحد پر اور رائے رایان رام دیو کی عملداری میں شامل تھا۔ علاقہ دیوگیر میں لشکر نے کسی قسم کی لوٹ مار نہ کی کیونکہ کسی آبادی، کھیت یا غلہ وغیرہ پر ہاتھ ڈالنا حکم سلطانی سے انحراف کرنا تھا۔ نیل کنٹھ میں دو روز قیام رہا اور اس عرصے میں اگلی منازل کا نظام العمل تیار کیا گیا۔

سلہ خزائن الفتوح صفحہ ۱۵ تا ۲۰

نیل کنٹھ سے روانہ ہوکر فوج دیوگری پہنچی۔ باج گزار راجہ رام دیو نے علائی لشکر کی بہت خاطرداری کی اور اُس کے لئے سامان رسد فراہم کیا۔ راجہ نے بازار میں دوکانداروں کو حکم دیا کہ علائی فوج کو مال ارزاں دیں جب روز شنبہ ۲۶ رجب کو فوج کوچ کے لئے کمر بستہ ہوئی تو چند منازل تک خود راجہ نے ملک نائب کا ساتھ دیا ۱۴ شعبان کو علائی لشکر کو نوبل پہنچا، جہاں ایک ہزار چاق و چست سوار منتخب لڑکے تلنگانہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے ملک کافور نے اپنے ساتھ لے لئے اور ارنگل (ورنگل) کے علاقہ میں داخل ہوا۔ تلنگانہ کے راستے بہت ہی دشوار گذار تھے تقریباً تمام مقامات ناہموار اور پتھریلے تھے۔ ندیوں کے ان پتھریلے خطوں سے گذرنے کے باعث عبور و مرور میں تکلیف ہوتی تھی بعض دفعہ فوج کو پہاڑوں پر بھی چڑھنا پڑتا تھا۔ جہاں انھیں چوٹیں لگیں اور زخم آئے۔ فوج کے بہترین گھوڑوں کو بھی ان پہاڑی راستوں کا طے کرنا تکلیف دہ تھا۔ اس تکلیف کے عالم میں جب ورنگل کے قریب ہوئے تو کثرت سے بارش ہونے لگی۔ اس کے بعد سیر اگر گڑھ پہنچے۔ جو دو ندیوں کے درمیان تھا۔ ایک کا نام لیشہر اور دوسری کا نام بوجی تھا۔ سپہ سالار افواج کو معلوم ہوا کہ یہاں ایک ایسا مقام ہے جس کی نسبت مشہور ہے کہ وہاں الماس کی کان ہے۔ لیکن اس نے یہ سن کر اس طرف توجہ نہ کی کیونکہ اسے سلطان کے احکام انجام دینے تھے اور جس کام کا حکم ہوا تھا اس کی تعمیل ناگزیر تھی۔[۲]

---

[۱] برنی نے دیوگر لکھا ہے (صفحہ ۳۲۰) فرشتہ نے دیوگڑھ۔ خزائن الفتوح صفحہ ۳۳ دیوگر کو یوگراحی بھی کہتے ہیں۔

[۲] خزائن الفتوح صفحہ (۸۷)

متواتر کوچ کرتا ہوا سلطانی لشکر تلنگانہ پہنچا۔ اور مٹی کے حصار کے پاس رکا اس وقت دستے کے آگے دو سردار چالیس سواروں کو لے کر بارہ بنے تھے جو انکنڈہ (ہنمانڈہ) کی پہاڑی پر چڑھے جہاں سے ورنگل کے اطراف واکناف اچھی طرح نظر آتے تھے ان دو سرداروں کا یہ کام تھا کہ اپنے سپہ سالار کو جو بہر انتخب سواروں کو لے کر پیچھے پیچھے آرہا تھا اچھی طرح راستے کے حالات سے واقف کریں ان دو سرداروں نے جب پہاڑی پر سے دیکھا تو غنیم کے چار سوار آتے ہوئے نظر آئے۔ جب یہ سوار قریب آئے تو ان پر تیر برسائے گئے جس پر ان میں سے ایک ہلاک ہو گیا۔ اس کا سر سپہ سالار لشکر کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ ہنمکنڈہ کے حصار کے پاس پہنچ کر ملک نے سایہ بان لعل استادہ کیا اور اس میں قیام کیا۔ عین دوپہر کے وقت ملک نے چند ساتھیوں کے ساتھ حصار کا معائنہ کیا۔ اس معائنہ میں سے دو ایک قلعہ نظر آیا

اس قلعے کے اطراف جو قلعہ ورنگل کہلاتا ہے ایک زبردست مٹی کی دیوار تھی جس پر منجنیق کے گولہ کا تک اثر نہ ہوتا تھا۔ اور اس مٹی کی دیوار میں جو مٹی کے برج تھے وہ اپنی وسعت کے باعث اور بھی زیادہ مضبوط تھے۔ اس پر راجہ کے علم لہرا رہے تھے اور ان برجوں پر بنڈیاں (بیل گاڑیاں) سامان جنگ فراہم کرنے کے لئے پھر رہی تھیں۔ راجہ کے چند سردار منجنیق کے لئے پتھر اکھٹا کر رہے تھے۔ کچھ اور لوگ اینٹوں کے پھینکنے اور تیر اندازی اور نیزہ بازی کے انتظامات میں مصروف تھے اس کے علاوہ اوپر سے چھوٹے نیزے پھینکنے کے انتظامات بھی کئے جا رہے تھے۔ یہ چھوٹے نیزے زوبین کہلاتے تھے۔

اس روز ملک نے صرف غنیم کے انتظامات سے واقف ہونے کی کوشش کی

اور چند مرکزی مقامات کا پتہ لگانے کے بعد واپس ہوا۔ دوسرے روز ملک کافور تمام فوج لے کر ہنمکنڈہ (انما کنڈہ) یا انمکنڈہ پہنچا اور دوبارہ وہاں کے حصار کے چاروں طرف پھر کر لشکر کے قیام گاہ کا معائنہ کیا تاکہ فوجی کیمپ قائم کیا جائے۔ اسی رات خواجہ نصیر الملک سراج الدولہ ملک حاجی نے لشکر کی تقسیم کی اور ہر حصہ کے لئے مقامات کا تعین کیا تاکہ قلعہ کا اچھی طرح محاصرہ کیا جا سکے۔

ملک کافور نے اپنا سایہ بان لعل دروازہ قلعہ ورنگل کے مقابلہ میں نصب کیا اور حصار کے چاروں طرف فوج کے ڈیرے ایسے قریب لگائے کہ کسی کو قلعہ سے نکلنے یا اس میں داخل ہونے کا موقع نہ ملے۔ اس رات قلعہ میں راجہ کی رعایا اور سپاہی بے فکر سو رہے تھے لیکن علائی لشکر نے تمام رات بیدار رہ کر اس کی نگرانی کی۔

قلعہ کے اس حصار کا دور جس کے اطراف علائی لشکر نے اپنے خیمے لگائے بارہ ہزار پانچ چھیالیس گز تھا۔ علائی لشکر کے ہر دس ہزار آدمیوں کے سپرد بارہ سو گز زمین کی دیکھ بھال تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ علائی فوج نے جنگ کی تیاری کی اور فوج کو عقبی حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے خیموں کے پیچھے ایک چوبی حصار تیار کرنے کا حکم دیا جس کی تیاری ایک فوجی دستے کے سپرد کی گئی۔ حکم ملتے ہی اس دستے نے کلہاڑیوں سے بے شمار درخت کاٹ کر انبار لگا دیئے جس کے بعد بڑھیوں نے حصار کی تعمیر شروع کی اور ایک مضبوط حصار تیار کر دیا۔

رات میں علائی فوج کا ایک دستہ ننگی تلواریں لئے لشکر کی حفاظت میں مصروف ہو گیا۔ آدھی رات کے قریب قلعہ کے مقدم مانک دیو کی سرکردگی میں راجہ کے ایک ہزار سواروں نے علائی فوج پر شبخون مارا۔ چونکہ علائی فوج کو اس کی

پہلے ہی سے خبر لگ چکی تھی لہٰذا وہ اس کے لئے تیار تھی۔ راجہ کے سواروں نے اچانک حملہ کیا تو علائی فوج نے نیزوں، گرزوں اور بھالوں سے اس کی خوب خبر لی اور تلواروں سے راجہ کے بیشمار سپاہیوں کو کاٹ کر خون کی ندی بہادی۔ جو سپاہی بچ گئے انھوں نے راہ فرار اختیار کی جن کا علائی فوج کے ایک رسالے نے تعاقب کیا اور انھیں گرفتار کرکے لشکر شاہی میں روانہ کیا۔

راجہ کے ان گرفتار شدہ سپاہیوں نے اس کی اطلاع دی کہ قصبہ دھدم میں جو درنگل سے چھ فرسنگ پر ہے راجہ نے ہاتھی چھپا رکھے ہیں۔ یہ خبر پاکر سردار لشکر نے قرابیگ کو تین ہزار سپاہی دے کر ان ہاتھیوں کو گرفتار کرکے لانے کا حکم دیا۔ قرابیگ لو مقام مذکور پر پہنچ کر اطلاع ملی کہ اس کے آنے سے پیشتر یہاں سے ہاتھی کسی دوسرے مقام پر بھیج دیئے گئے ہیں جس پر اس نے تعاقب کیا اور کچھ دور جانے کے بعد انھیں گرفتار کر لیا۔

ملک حاجی نائب امیر حاجب نے چند خاص سواروں کو لدر دیو کا تعاقب کرنے کے لئے روانہ کیا اور حکم دیا کہ جہاں کہیں راجہ کے سردار ملیں ان کے سر کاٹ کر روانہ کر دیئے جائیں۔ جب راجہ کی فوج کے چند سرداروں کے سر پہنچے تو ملک نے انھیں حصار کے اطراف رکھوا دیا۔ اس کے بعد پتھر کے گولے جمع کرنے کا حکم دیا تاکہ حصار میں گولہ باری کے ذریعہ سے ڈالے جا سکیں۔ جب پتھر جمع ہوئے تو منجنیق اور غرادہ کے ذریعہ خوب گولہ باری کی گئی جس سے قلعہ کو سخت نقصان پہنچا۔

قلعہ دحصار کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے لئے فصیل کے باہر گرگچ یعنی ایک بلند چبوترہ تیار کیا گیا جس پر سے قلعہ کی ہر چیز دکھائی دینے لگی۔ ان بلند چبوتروں

اور حصار کے درمیان گہری اور وسیع خندق تھی جس کو عبور کرنا مشکل تھا لیکن اُسے عبور کئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ لہٰذا اسے مٹی بھر کر پاٹ دیا گیا اور خاص طور پر حصار کے اُن مضبوط حصّوں کو جن پر راجہ کو کافی اعتماد تھا گولہ باری کر کے چور چور کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی کے ذریعہ گولہ باری کر کے دروازوں کی دیواروں کو توڑ دیا گیا جس کے بعد فتح کے آثار شروع ہو گئے۔ گولہ باری کے باعث دیواروں کے ٹوٹنے سے خندق بھر گئی اس کے بعد بھی دیوار کا جو کچھ حصّہ باقی رہا اُس پر چڑھنے کے لئے فوراً ایسی سیڑھی تیار کرنے کا حکم دیا گیا جس پر سَو آدمی ایک ساتھ پرا باندھ کر بے تکلف چڑھ سکیں لیکن اس کام کے تکمیل پانے کے لئے چند روز درکار تھے

روز شنبہ بتاریخ ۱۱ رمضان رات میں علائی لشکر کے لوگ نماز تراویح میں مشغول تھے لیکن جب صبح نمودار ہوئی تو انتظامات کی خوبی کے باعث شب ہی میں سیڑھی تیار ہو چکی تھی۔ طبل جنگ بجا تو سیڑھی قلعہ کی دیوار سے لگا دی گئی۔ سپاہی خندق کی طرف وضو کے لئے دوڑے اور نماز فجر ادا کی جس کے بعد لشکر ترتیب دیا گیا، آفتاب کافی بلند ہوا تو سپہ سالار نے فوج لے کر قلعہ کا رُخ کیا۔ جب سپاہی قلعہ کی دیوار کے قریب پہنچے تو حکم ملتے ہی فوراً اُس پر چڑھ گئے اور تیر برسانا شروع کیا جس سے راجہ کے سپاہیوں کو بُری طرح زخم آئے۔ اور بہت سے ہلاک ہو گئے ادھر بعض سپاہیوں نے مٹی کا حصار توڑ ڈالا بعضوں نے حصار میں نقب لگائی۔ تلواروں اور نیزوں سے حصار میں رخنے ڈالے گئے۔ سیڑھیوں کے ذریعہ علائی فوج کا ایک حصّہ فصیل پر چڑھ جانے میں کوشاں تھا۔ جب سُرنگ کے باعث دیوار گر گئی تو راجہ کے جو سپاہی اس پر مقرر تھے ان سب کا خاتمہ ہو گیا۔ آخر کار دونوں فوجیں

دوبدو ہوگئیں۔ علائی فوج کی چند ٹکریاں مٹی کے برجوں پر ہاتھوں کی مدد سے چڑھ گئیں۔ اور ان پر قبضہ جما لیا۔ ۳۰ ر رمضان المبارک بروز یکشنبہ جب دونوں جانب افواج سرگرم پیکار تھیں یک بیک قلعہ میں آگ لگ گئی۔

چہار شنبہ کو علائی فوج نے پتھر کی فصیل کا محاصرہ کر لیا تاکہ کوئی متنفس قلعہ کے باہر نہ ہونے پائے۔ لیکن پتھر کی فصیل بیحد استوار تھی اس کے پتھروں میں کوئی شگاف نہ تھا، جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا۔ پتھر بھی چکنے اور صاف تھے اس لیے منجنیق سے ان کا توڑنا محال تھا فصیل کی بلندی علائی دستوں کو چڑھ جانے کی اجازت نہ دیتی تھی اور بنیادیں گہری ہونے کے سبب نقب زنی کا کوئی امکان نہ تھا اس فصیل کی خندق بھی کافی وسیع تھی لیکن فوج نے اسے پیر کر عبور کیا اور دیوار میں سرنگ لگانے کی کوشش کی۔ حفاظت کی خاطر سپہ سالار نے اپنی فوج کے اطراف مورچے لگوائے اور قلعہ پر تیر برسانے کا حکم دیا۔ ان تیروں میں جو قلعہ کی فوج پر برسائے گئے تھے زہر آلود تیر بھی تھے، جن سے گھائل ہو کر راجہ کی فوج کے بڑے بڑے سردار لقمۂ اجل ہو گئے۔ تیروں کا مینھ اس زور پر تھا کہ قلعہ کے اندر کھلبلی مچا اور فوج میں انتشار پیدا ہوا۔ اس وقت علائی فوج نے تیروں کی مشعلیں بنا کر پھینکنا شروع کیا جس کے باعث اندرون حصار تمام مکانات میں آگ لگ گئی۔ اور بہت سے لوگ نذر آتش ہو گئے۔ اس عالم میں علائی فوج کے سپاہی عجلت کی خاطر جوشن اتار کر فوراً قلعہ میں گھس گئے جہاں انہیں رائے کی فوج سے تلوار سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اس معرکہ میں علائی فوج نے حصار پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح رائے کی فوج میں جو سپاہی تیروں کے زہر اور آگ سے سلامت بچے تھے

انھوں نے تلوار کی دھار کے نیچے اپنی جان دیدی۔

دہشت کے مارے حصار کے مقدم یعنی نگران کار کا بھائی انا نیر جو مشغول انتظامات تھا اپنی جان بچانے کی خاطر قریب کے کھیتوں میں روپوش ہوا۔ اطلاع ملنے پر ملک کافور نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے اسے رات ہی میں گرفتار کر کے اپنی حفاظت میں رکھا تاکہ صبح قتل کر دیا جائے۔ جب قلعہ بالکل تاراج ہو گیا تو باقی ماندہ شکست خوردہ لوگ بھاگ کر راے کے پاس پہنچے اور انتہائی بدحواسی کے ساتھ قلعہ کی بربادی کا حال عرض کیا جس کے سننے سے راے کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور جذبۂ انتقام بھڑک اٹھا لیکن مصلحت اسی میں دیکھی کہ گرفتار ہو جائے تاکہ صلح کی کوئی صورت نکل آئے ورنہ قلعہ کے تباہ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔[۵]

علائی فوج کے منظم حملے کے باعث فصیل کے اندر جو غنیم کا لشکر تھا اسے شبخوں کا موقع نہ ملا جس کی وجہ سے غنیم نے تنگ آ کر ہتھیار ڈال دیئے اور راجہ رام دیو راجہ ورنگل نے طوعاً و کرہاً صلح کے لئے آمادگی ظاہر کی۔

برہمنوں اور تجربہ کار بھاٹیوں اور خدمت گذاروں کو ملک نائب کی خدمت میں روانہ کیا۔ کافور کے محاصرہ کے انھی اصولوں سے تقریباً دو صدی بعد شیر شاہ[۵] نے کام لیا

قلعہ ورنگل کے محاصرے میں علائی فوج کو کڑی مصیبت جھیلنی پڑی کیونکہ مٹی کی فصیل اتنی مضبوط تھی کہ مسلسل سنگ باری کے بعد مشکل سے ٹوٹی۔ پھر جب فوج اندر داخل ہو گئی تو ایک اور فصیل اور وہ بھی پتھر کی ان کے سامنے حائل تھی

شدید حملے نے اس میں بھی راستہ پیدا کر دیا۔ ناچار راجہ صلح کا خواہاں ہوا اور چند برہمن سفراملک کافور کی خدمت میں روانہ کئے۔ لدر دیو کے پاس بے اندازہ دولت تھی جو کلیتہً اس کی نگرانی میں تھی۔ جب اسے کوئی تدبیر نہ سوجھی تو ایک قلیل رقم کے ساتھ قاصد کو روانہ کیا اور اطاعت پر آمادگی ظاہر کی حتیٰ کہ خزانہ کی کنجیاں بھی حوالہ کرنے پر تیار ہوا۔

راجہ کے پاس بہترین جواہر اور موتی تھے۔ بیس ہزار اعلیٰ قسم کے گھوڑے تھے اور ہر ایک کا ایک علیحدہ سائیس بھی تھا۔ لدر دیو نے ان تمام مال و دولت اور ہاتھی گھوڑوں کو سفرا کے ہمراہ بھیج دیا۔ اور اطلاع دی کہ حکم سپہ سالار پر خود بھی حاضر ہو جائے گا۔ راجہ نے مزید دولت پیش کرنے اور آیندہ خدمت کرنے کا بھی اقرار کیا بشرطیکہ اس کو جان کی امان ملے۔ اس پیغام پر ملک کافور مطمئن نہ ہوا کیونکہ وہ اس کی دغابازی اور چرب زبانی سے خوب واقف تھا۔ اس نے مال و دولت کی طرف بھی نظر نہ اٹھائی۔ اس عرصے میں قلعہ پر پوری طرح ملک کافور کا سکہ جم گیا۔ رائے نے مجبور ہو کر خضر خاں ولیعہد کا واسطہ دیا اور درخواست کی کہ گولہ باری اور جدال و قتال کو موقوف کیا جائے اور محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ اس پر ملک نے حکم دیا کہ رائے کی جان بخشی اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ بقیہ تمام مال و دولت اور ہاتھی گھوڑے پیش کر دے تاکہ انھیں بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا جائے اور اگر اس کی پابندی نہ ہوئی تو راجہ قتل کر دیا جائے گا اور تمام قلعہ مسمار کر دیا جائے گا۔

اس اطلاع پر رائے بہت پریشان ہو گیا اور ملک کے حکم کی پابجائی کی

کوشش کی راتوں رات اُس نے جتنے بھی جواہرات دستیاب ہو سکتے تھے سب جمع کئے تاکہ صبح دم سپہ سالار کے حضور میں بھیج دیئے جائیں۔ علی الصباح اس دولت کو لے کر راجہ کے سفرا سایہ بان لعل کے آگے علم کے منتظر ٹھہرے رہے ملک نے تمام سرداران لشکر کو طلب کیا اور سب اپنے مراتب کے اعتبار سے بیٹھ گئے اور عوام و خواص بھی جمع ہوئے۔ پھر رائے کے سفرا بھی پیش ہوئے۔ سفرا نے زمین بوسی کی اور حسب وعدہ ہاتھی پیش کئے جو ہودج عماری اور زنجیر و ہیکل سے سجے ہوئے تھے۔ ان کے دانتوں پر سونا چاندی لپٹی ہوئی تھی اور جسم پر قیمتی کپڑوں کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کو زیورات سے آراستہ کیا گیا تھا۔

پھر تحفہ تحفہ جواہرات پیش کئے گئے جو بہت ہی نفیس تھے۔ ان میں نہایت ہی سرخ رنگ کے بہترین یاقوت اور سبز رنگ زمرد تھے عین الطیرا ایک قسم کا قیمتی پتھر، عین الدیک، زمرد ریحانی، الماس، وغیرہ نذر کئے گئے۔ اس کے بعد گھوڑوں کے پیش کرنے کی باری آئی جو صبا رفتار اور وضع دار تھے۔[۱]

برنی نے لکھا ہے کہ لدر دیو نے سو ہاتھی سات ہزار گھوڑے اور برسوں کا جمع کیا ہوا خزانہ اور کثیر جواہر و نفایس سپہ سالار کے حضور میں گذرانے۔[۲]

الغرض رائے کو آبا و اجداد سے جو کچھ ثروت ملی تھی اُس سے ہاتھ دھونا پڑا کیمبرج تاریخ ہند جلد سوم میں لکھا ہے کہ راجہ نے اطاعت قبول کرنے کے بعد تین سو ہاتھی، سات ہزار گھوڑے اور بہت سے سکے اور جواہر پیش کئے اور سالانہ خراج

---

[۱] خزائن الفتوح صفحہ (۱۱۰ تا ۱۱۹)

[۲] برنی صفحہ (۳۳۰)

دینے کا بھی پیمان کیا۔

ملک ان جواہرات کے پاس کھڑا رہا۔ اور سب کی تفصیل وار فہرست مرتب کروائی تمام جواہرات چھانٹ چھانٹ کر علیحدہ کر دیئے گئے۔ جب ملک کو یقین ہو گیا کہ راجہ[1] نے تمام جواہرات حاضر کر دیئے ہیں تو پھر اس نے ایلچیوں سے چند سوالات کئے جن کا ٹھیک جواب نہ دینے پر قتل کی دھمکی دی منجملہ ان سوالات کے ایک سوال یہ تھا کہ آیا راجہ نے ان سے بہتر جواہرات اپنے پاس تو نہیں رکھے۔ سفراء نے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ ان جواہرات میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا جواب دنیا میں نہیں۔

۱۶ شوال کو محاصرہ ہٹا لیا گیا۔ تمام فوج جمع کر لی گئی اور کوچ کا نقارہ بجا۔ لشکر دیوگر، جھا۔ اور جھابن کی راہ سے ۱۱ محرم ۷۱۱ھ کو دہلی پہنچا۔ اپنے آنے سے قبل ملک کافور نے فتح نامہ دہلی ارسال کیا تھا جو مساجد میں منبروں پر پڑھا گیا اور فرط انبساط سے شادیانے بجائے گئے۔ ۲۴ محرم بروز سہ شنبہ دروازہ بدایوں کے قریب کے میدان میں کوشک سیاہ استادہ کیا گیا اور اطراف و اکناف کے تمام صوبہ دار طلب کئے گئے۔ بادشاہ نے دربار کیا۔ اور ملک کافور نے تمام مال غنیمت سرکار سلطانی میں نذر کیا۔ اس وقت بادشاہ کے درشن کی عام اجازت تھی اور عوام کو بھی مال غنیمت کے دیکھنے کا موقع دیا گیا۔[2]

سلطان کا یہ اصول تھا کہ دہلی کے اطراف جہاں کہیں لشکر ہو پہنچتا تو دہلی سے

---

[1] ورنگل کا راجہ پرتاپ رودر دیو تھا جو ککتیا خاندان کا ساتواں حکمران تھا۔ ٹری ول انڈیا۔ راجہ کا نام لدر دیو تھا۔ خزائن الفتوح ص ۹۶

[2] خزائن الفتوح صفحہ (۱۲۲)

تل پت اور پھر وہاں سے اس جگہ تک جہاں کا عزم تھا درمیان میں تھانے مقرر کرتا اور ہر منزل پہ خبر پہنچانے کے لئے سوار مقرر کرتا جن کے پاس تیز رو گھوڑے ہوتے تھے راستہ کا معقول بندوبست کیا جاتا اور ہر قصبہ اور موضع میں عہدہ دار اور کیفیت نویس ہوتے تھے۔ اسی انتظام کی بدولت سلطان کو ہر روز یا دو تین روز میں مسافت کے لحاظ سے لشکر کی تمام کیفیت ملتی تھی اور پھر سلطان کی جانب سے ہدایات روانہ کی جاتی تھیں اور ان کی تعمیل میں سرمو فرق نہ آتا تھا۔

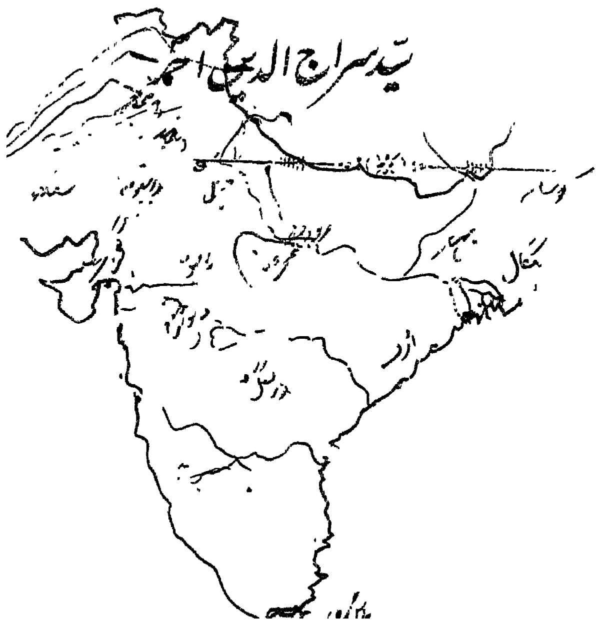
تلنگل کے حملے کے لئے فوج بھیجتے وقت سلطان نے راستہ میں ڈاک چوکی کا مکمل اہتمام کر لیا تھا تاکہ فوج کی نقل و حرکت اور حملوں کی تمام خبریں بآسانی دہلی پہنچتی رہیں۔ لیکن جب کافور مٹی کی حصار توڑنے میں مصروف تھا تو اس میں دو ہفتے لگ گئے۔ اس عرصے میں راستے میں مخالفین کے اشارے سے ایک دو تھانے توڑ دیئے گئے جس کی وجہ سے لشکر کی کوئی اطلاع سلطان کو نہ ملی جب خبر نہ پہنچ کر چالیس روز سے زائد عرصہ گذر گیا تو سلطان کو تشویش ہوئی تو اس نے شہر کے بزرگوں روساء اکابرین سے مشورہ کیا۔ ایک دن اس نے ملک قرا بیگ اور قاضی مغیث بیانوی کو حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں روانہ کیا اور ان دونوں کو تاکید فرمائی کہ جو کچھ شیخ ارشاد فرمائیں حرف بحرف بیان کریں۔ شیخ نے فتح کی بشارت دی[1]۔ اور فرمایا کہ یہی ایک فتح نہیں بلکہ اور فتوحات کا میں منتظر ہوں۔ یہ سن کر سلطان بہت خوش ہوا۔ چونکہ علاء الدین کو شیخ کے الفاظ پر بہت اعتماد تھا[2] لہذا اس نے اور فتوحات کی نسبت خیال کرنا شروع کیا

---

[1] برنی صفحہ ۳۳۱
[2] [illegible] ۱۱۰۱ [illegible]

چند ہی روز بعد سپہ سالار ملک کافور مع فوج دہلی آیا اور ورنگل کا فتح نامہ مع مال غنیمت سلطان کے حضور میں پیش کیا۔ علائی فوج کے کامیاب لوٹنے پر دارالسلطنت میں نصرت و ظفریابی کے نقارے بجائے گئے اور جمعہ کے روز منبر پہ فتح نامہ پڑھا گیا۔

سلطان نے گو اپنے تمام عہد میں کبھی حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ سے ملاقات نہ کی لیکن ان کی مخالفت میں بھی اس نے کبھی کوئی بات زبان سے نہ نکالی۔ اگرچہ بعض لوگوں نے سلطان کو بہت کچھ شیخ کے خلاف بھکانے کی کوشش کی بعضوں نے شیخ کے اخراجات کی شکایت کی لیکن سلطان نے اس پر کان نہ دھرا۔ اپنے آخری عہد میں وہ شیخ کا بہت معتقد ہو گیا تھا پھر بھی اُسے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا۔



ابراہیم قطب شاہ تخت نشینی سے پہلے

ابوالمظفر ابراہیم قطب شاہ جو ۱۵۵۰ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ سلطنت گولکنڈہ کا حقیقی معمار ہے اس کو سلطنت گولکنڈہ کی تعمیر اور توسیع کا حقیقی ذمہ دار سمجھنا چاہئے لیکن یہ ان حکمرانوں میں سے ہے جس کو حصول سلطنت تو کجا خود اپنی بقا کے لئے زندگی کے سخت تلاطم سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی کشاکش حیات کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔ جب گولکنڈہ کے بانی مبانی سلطان قلی قطب شاہ کا انتقال ہوا تو اس کے جانشینوں کی خود غرضی کی وجہ سے گولکنڈہ کی در و دیوار پر تاریکی چھا گئی تھی۔ ریاست کے تار و پود جگہ جگہ سے بکھر رہے تھے راعی و رعایا کے خوشگوار تعلقات باقی نہ تھے۔ لائق لوگ یا تو پابزنجیر تھے یا ملک چھوڑ کر بھاگ رہے تھے اور خانہ جنگیوں کا بازار گرم تھا۔ یہ جمشید قطب شاہ کے عہد کا ماحصل ہے۔ ابراہیم قطب شاہ انھیں افسوس ناک حالات کا شکار تھا۔ اس کو پہلے اپنی جان بچانے کے لئے حدود سلطنت سے باہر بھاگنا اور ایک غیر ملک میں پناہ لینا پڑا تھا۔ جلاوطنی کی تمام مشکلات برداشت کرکے اور مختلف مزاحمتوں کا مقابلہ کرکے اس کا تخت گولکنڈہ پر اجلاس کرنا ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس کو تخت نہ ملتا تو قطب شاہی خاندان کا جمشید قطب شاہ کے بعد ہی خاتمہ ہو جاتا۔ اور گولکنڈہ کی دو سو سالہ عظمت کبھی نہ پیدا ہوتی۔

ابراہیم قطب شاہ اپنے تمام بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ سلطان قلی قطب شاہ

کے چھ بیٹے تھے۔ حیدر قلی سب سے بڑا تھا جو ولیعہدی کے لئے نامزد تھا لیکن یہ اپنے باپ کی زندگی میں راہی عدم ہو چکا تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا تو گولکنڈہ کے بڑے سلاطین میں اس کا شمار ہوتا۔ اس کی موت گولکنڈہ کی تاریخ کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان تھا۔ دوسرا بیٹا قطب الدین تھا جو اپنے مرحوم بھائی کی جگہ ولیعہدی کے لئے نامزد کر دیا گیا تھا۔ لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین میں وہ حوصلے اور حمیت نہیں تھی جو ایک والی ملک کے لئے ضروری ہے۔ اس نے ایک خاموش طبیعت پائی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈہ کے تمام سیاسی حلقے اس کی دسترس سے باہر تھے اور اس کے دشمن اس کو آسانی سے بے دست و پا کر سکتے تھے اس کے چھوٹے بھائی جمشید قلی، عبدالکریم اور دولت قلی اس سے کہیں زیادہ حوصلہ مند اور تیز طبیعت واقع ہوئے تھے اور بچپن سے سلطنت کا سودا سر میں رکھتے تھے چنانچہ جمشید قلی جو تیسرا بیٹا تھا اپنے بڑے بھائی کے ہوتے ہوئے سلطنت کا مدعی بن گیا تھا اور حصول سلطنت کے لئے ہر قبیح فعل یہاں تک کہ پدرکشی سے بھی اس کو دریغ نہیں تھا۔ چونکہ بہت دنوں سے اس میں بدنیتی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے اس لئے سلطان قلی شاہ نے اس کو گولکنڈہ کے قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ عبدالکریم جو چوتھا بیٹا تھا اس کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تو باپ کے خلاف کھلی بغاوت کر دی تھی۔ جب حدود سلطنت میں اس کی ایک نہ چلی تو بیجاپور جا کر باغیانہ مواد فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن یہ تمام کوشش اس کی بار ور نہیں ہوئی تھی اور وہ بالآخر بیجاپور کے علاقہ میں مر گیا تھا۔ پانچواں بیٹا دولت قلی تھا

جس کو علیحدہ سلطنت کی فکر دامنگیر تھی اور غالباً اس سے کچھ ایسے ناشائستہ حرکات سرزد ہوئے ہوں گے کہ لوگ اس کو دیوانہ ملک زادہ کہتے تھے اور اس کے مخدوش رویہ کی وجہ سے سلطان قلی قطب شاہ نے اس کو بھی میونگر کے قلعہ میں قید رکھا تھا تاکہ دوسرے باغیوں کے ساتھ اس کا میل جول نہ ہونے پائے اور سلطنت میں خلل واقع نہ ہو۔ اس کی تمام عمر قید میں گذری اور قید ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ چھٹا بیٹا ابراہیم قطب تھا جس کی پاکیزہ زندگی بچپن سے اس کو ممتاز رکھتی تھی۔ اپنے دوسرے بھائیوں سے الگ تھلگ یہ ہونہار شاہزادہ شروع سے کچھ ایسی سنجیدگی اور باپ کے ساتھ وفاشعاری ظاہر کرتا تھا کہ سلطان قلی قطب شاہ اس سے بہت خوش تھا۔ ایسی تاریک فضا میں جبکہ اس کے بڑے بھائی سلطنت کے خواب دیکھتے تھے اور باپ کے خلاف بغاوت کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے ابراہیم قطب کی سنجیدگی اور شرافت اس کی آئندہ عظمت کا پیام دیتی تھی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کے پاکیزہ رجحانات کو دیکھ کر سلطان قلی نے نہ صرف اس کی تعلیم و تربیت میں کافی دلچسپی لی۔ بلکہ عملی تجربوں کے لئے اس کو سلطنت کے بعض انتظامی کام بھی تفویض کر رکھے تھے۔ چنانچہ تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے کہ یہ سلطان قطب شاہ کے آخری زمانہ میں دیورکنڈہ میں متعین تھا[1]۔ تاکہ وہاں امن قائم کرے۔ چونکہ یہ مشرقی اقطاع سلطان قلی کے عہد میں مفتوح ہوئے تھے یہاں غالباً خاطر خواہ امن نہیں تھا بلکہ کچھ تعمیری انتظام کی ضرورت تھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ابراہیم دیورکنڈہ میں کب متعین کیا گیا تھا۔ لیکن تاریخ

---

[1] تاریخ قطب شاہی صفحہ ۱

قطب شاہی کا یہ بیان کہ باپ کے انتقال کے وقت ابراہیم سن شعور کو نہیں پہنچا تھا[۱] صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ دیورکنڈہ کے انتظام کی تفویض جو اسی تاریخ سے معلوم ہوتی ہے وہ اس چھوٹی عمر میں ممکن نہیں ہے۔ نہ صرف نظم ونسق بلکہ اس انتظامی قابلیت سے جو اس نے یہاں ظاہر کی تھی ضروری ہے کہ نہ صرف سلطان قلی کے انتقال کے وقت بلکہ اس سے پہلے جبکہ یہ دیورکنڈہ پر متعین کیا گیا تھا اس کی عمر کافی ہوگی اس کے بعد دیورکنڈہ کے شروفساد کے متعلق پھر کوئی خبر نہیں سنائی دیتی اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کافی سدباب ہو گیا ہوگا جو ابراہیم کی انتظامی قابلیت کی دلیل ہے۔ ابراہیم کے اصل سیاسی جوہر اس وقت ظاہر ہوئے جبکہ اس کو اپنے باپ کے انتقال کے بعد حدود سلطنت چھوڑنے پڑے اور ایک غیر ملک میں پناہ لینی پڑی تھی۔ بیجانگر سے غیر ملک میں جو ایک ہندو سلطنت تھی اپنی جگہ پیدا کرنا اور وہاں سے حصول سلطنت کی کامیاب تدبیر اختیار کرنا ابراہیم کی غیر معمولی قابلیت کی دلیل ہے اس کے پاکیزہ اخلاق اور سیاسی عظمت کا اثر یہ تھا کہ کئی آدمی اس کے ساتھ ہر قسم کا ایثار کرنے کو تیار تھے اور بیجانگر کی تکلیف دہ بادیہ نوردی میں اس کے ساتھ ہر قسم کی مصیبت جھیلتے تھے۔ جمشید کے انتقال کے بعد جب گولکنڈہ کی بساط اُلٹی تو دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں جو اس وقت زندہ تھے سلطنت گولکنڈہ میں ابراہیم کے ساتھ جو عام ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا وہ اس کی عظمت کا بین ثبوت تھا اور عجیب بات ہے کہ جب ابراہیم یا قطب شاہی کارواں بیجانگر سے گولکنڈہ کی طرف پیشقدمی کرنے لگا لوگ جوق جوق اس کے گرد جمع ہونے لگے اور سلطنت کا

۱؎ تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۳

سیاسی مطلع خود بخود صاف ہونے لگا۔ ان دشمنوں کے باوجود ابراہیم قطب شاہ کا بلا خطے تخت سلطنت پر جلوس کرنا بڑا کارنامہ تھا۔ جس میں قدرتی حالات کے ساتھ خود ابراہیم کی ذاتی قابلیت اور تدبر کو بڑا دخل ہے جو اُس کے دوسرے بھائیوں میں مفقود تھے۔

سُلطان قلی قطب شاہ کا انتقال اور گول کنڈہ کی خانہ جنگی

اگرچہ جمشید اپنے باغیانہ رویہ کی بنا پر باپ کی زندگی میں قید تھا لیکن یہ اُس کی جسمانی قید تھی اور اس کا مفسدانہ دماغ اپنے کام میں مصروف تھا۔ قید و بند میں بھی اس نے اپنے تمام ہتھکنڈے استعمال کئے۔ اس کے نزدیک حصول سلطنت کا سب سے زیادہ سریع اور آسان طریقہ کار یہ تھا کہ باپ کا طبعی موت سے پہلے خاتمہ کردے کیونکہ اُس کو یہ معلوم تھا کہ سلطان قلی کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو اس کو سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ اِس دوران میں قطب الدین کو اپنے ہاتھ پھر مضبوط کرنے کا کافی موقعہ ملا یا یہ بھی اغلب تھا کہ سُلطان قلی اپنی کبرسنی کا لحاظ کرکے قطب الدین کو خود اپنی زندگی میں تخت نشین کر دیتا۔ ان تمام امور کی پیش بندی کرکے جمشید نے باپ کو مارنے کا پورا بندوبست کرلیا۔ محمود ہمدانی ایک سیہ کار کو اِس کام کے لئے متعین کیا گیا تھا۔ جب محمود کے ذریعہ سلطان قلی سے فراغت ہوگئی تو دوسرا کام ولیعہد سلطنت قطب الدین کو بے دست و پا کرنا تھا چونکہ قطب الدین اپنی خاموش طبیعت کی وجہ سے ویسے ہی بے اثر تھا لہٰذا آسانی سے اس کے گھر کا محاصرہ کرلیا گیا اور اس کو اندھا کرکے اِس طرح

---

[1] قطب شاہی ۱۰۷

بے بس کر دیا گیا کہ پھر اُس کے دوبارہ اُبھرنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ ان بدنہاد رزیلیہ افعال سے کام لے کر جمشید قطب شاہ ۹۵۰ھ ۱۵۴۳ء میں تخت سلطنت پر بیٹھ گیا گو اس طریقہ سے وہ سلطنت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن بہت سی مزاحمتیں اور باقی تھیں ایک طرف تمام رعایا و برایا کو ہموار کرنا تھا جو اس کے شنیع افعال سے کبھی خوش نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب سلطان قلی کے قتل اور قطب الدین کے اندھے ہونے کی خبر مشہور ہوئی تو ہر طرف سنسنی پھیل گئی اور لوگ جمشید کو سخت مطعون کرنے لگے دوسرے سلطنت کے اور دعویدار باقی تھے جن کا راستے سے ہٹانا بھی ضرور تھا۔ ان دعویداروں میں دولت قلی اور ابراہیم تھے۔ ان کے متعلق ڈر یہ تھا کہ اگر یہ اپنی حالت پر چھوڑ دیئے جائیں تو ممکن ہے کہ اہل ملک جو جمشید سے ناخوش تھے کل کو دولت قلی اور ابراہیم کا ساتھ دیں اور ان کو تخت سلطنت دلانے کی کوشش کریں۔ دولت قلی تو بھونگیر میں قید تھا اس کی قید سخت کر دی گئی لیکن ابراہیم کا مقابلہ بہت مشکل تھا اور اس سے ڈرنے کی کافی وجہ تھی اوّل تو ابراہیم مقید نہ تھا۔ دوسرے اس کی قابلیت نہ صرف سلطان مرحوم بلکہ تمام سلطنت کو متاثر کیے ہوئے تھی۔ جہاں دوسرے بھائی اپنے باغیانہ رویہ کی وجہ سے مقید و مطعون تھے ابراہیم نہ صرف آزاد تھا بلکہ امور سلطنت کے انصرام کا اہل سمجھا جاتا تھا ایسے دعویدار سلطنت کو راستے سے ہٹانا اور اس سے اطمینان حاصل کرنا جمشید کے بس کی بات نہ تھی۔ جمشید کے پاس اس وقت صرف یہ چارہ کار تھا کہ مختلف طریقوں سے ابراہیم کو گولکنڈہ طلب کرے۔ چنانچہ یہی کیا گیا۔

ظاہر ہے کہ جمشید کا بلاوا ابراہیم کے لئے سخت معنی خیز تھا جب قطب الدین

کو جو جائز وارث تخت تھا اندھا کرکے بے دست و پا کر دیا گیا تھا تو ابراہیم کو جمشید
سے کیا توقع ہو سکتی تھی۔ ابراہیم کو جمشید سے ڈرنے کی کافی وجہ تھی۔ ابراہیم کی سلامتی
اس بات میں تھی کہ وہ دیورکنڈہ سے بھاگ کر کسی اور جگہ جان بچائے۔ اس بارے
میں اس نے ان ہمدردوں سے رائے لی جو اس کے ساتھ تھے اور ہر ایثار کے لئے
تیار تھے۔ حمید خاں حبشی، سیدی سلحدار، دلاور خاں، کاماجی برہمن وہ ہمدرد تھے
جنھوں نے ابراہیم کا آخری دم تک ساتھ دیا تھا اور ہر مصیبت جھیل کر اس کو بالآخر
تخت سلطنت پر بٹھایا تھا۔ ان ہستیوں کے نام اور کارناموں کی وضاحت کے
بغیر ابراہیم قطب شاہ کی تاریخ پوری نہیں ہوتی۔ ان لوگوں نے اس کو بیدر
جانے کی صلاح دی تاکہ والئی بیدر سے مل کر اپنی بقا کی تدبیریں سوچے۔ ابوالقاسم
فرشتہ بیدر جانے کا کوئی ذکر نہیں کرتا بلکہ اس کا بیان یہ ہے کہ ابراہیم دیورکنڈہ
سے سیدھا بیجانگر بھاگ گیا تھا۔ لیکن تاریخ قطب شاہی سے واضح ہوتا ہے کہ
ابراہیم پہلے بیدر گیا تھا اور بریدسے امداد لی تھی اور برید نے ابراہیم کا خاطر خواہ
خیر مقدم کیا تھا۔ برید کو ابراہیم سے کوئی ہمدردی تو نہ تھی۔ لیکن بریدیوں کی خاص
سیاست ایسے مواقع کی متلاشی رہتی تھی۔ چونکہ وہ خود طاقتور نہ تھے اس لئے وہ اپنی
ہمسایہ سلطنتوں کو آپس میں لڑا کر اپنا بچاؤ دیکھتے تھے۔ اس دعویدار سلطنت کے بیدر آنے
سے برید کو گولکنڈہ پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اگر برید اور ابراہیم کا متحدہ حملہ گولکنڈہ
پر کامیاب ہو جاتا تو ظاہر ہے کہ ابراہیم کا بادشاہ ہونا برید کے لئے زیادہ مفید ہوتا
کیونکہ ابراہیم کو برید کا ممنون احسان ہونا پڑتا اور اس طریقہ سے گولکنڈہ میں
برید کے بہت اثرات پیدا ہو جاتے چنانچہ تمام منصوبوں کی پیشرفت میں برید اپنی

فوجوں کے ساتھ ۱۵۴۳ء میں گولکنڈہ کی دیواروں کے سامنے آگیا[1]۔

گولکنڈہ پر برید اور ابراہیم کا حملہ

ابراہیم کے متعلق یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ صرف اس غرض سے آیا تھا کہ برید کی تائید سے گولکنڈہ پر حملہ کرے اور جمشید کو زیر کرکے خود تخت حاصل کرے۔ اول تو ابراہیم کو برید کی امداد کی کوئی امید نہ تھی اگر امید ہوتی بھی تو اس سے گولکنڈہ فتح کرنے کے کہاں قرائن تھے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ دوسرے ہمسایہ سلاطین کے مقابلہ میں ابراہیم کو کچھ برید سے ہی توقع تھی۔ یہ لوگ اپنے سیاسی اغراض کے تحت ہمیشہ اس کے لئے آمادہ رہتے تھے۔ بیجاپور اور احمدنگر سے اس قسم کی کوئی توقع نہ تھی۔ حمید خاں اور سید جی وغیرہ نے جو رائے دی تھی وہ بے محل نہ تھی اور کامیابی کی توقع غالباً اس وجہ سے تھی کہ جمشید اپنے شنیع افعال کی وجہ سے گولکنڈہ میں ہر دلعزیز نہ تھا بلکہ لوگ اس سے بیزار تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب بریدی افواج گولکنڈہ کی طرف بڑھیں تو قلعہ کی دیواروں تک کوئی مزاحمت نہیں ہوئی اور ابراہیم اور برید نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ اگرچہ محاصرہ کے دوران میں فریقین میں برابر کے معرکے ہوئے اور فریقین کا کافی نقصان ہوا لیکن اس کے باوجود جمشید کی کامیابی بڑے خطرہ میں تھی کیونکہ جو افواج اس کے تحت کام کرتی تھیں وہ اس سے خوش نہ تھیں لیکن جمشید کی خوش قسمتی سے برہان نظام شاہ والی احمدنگر نے اس موقع پر گولکنڈہ کی امداد بہت ضروری سمجھی۔ شاہ طاہر نے برہان کو یہ مشورہ دیا کہ اگر برید گولکنڈہ پر قابض ہو جائے تو ممکن ہے تمام دکن پر اس کا تسلط ہو جائے۔ احمدنگر کی

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۰۸

ایک بڑی فوج گولکنڈہ کی طرف بڑھائی اور بریدی کی توجہ کو منعطف کرنے کے لئے اس فوج نے یہ کام کیا کہ قلعہ کوہیر کا محاصرہ کر لیا۔ احمد نگر کی یہ نقل و حرکت برید کے لئے بہت پریشان کن تھی۔ خود بیدر معرضِ خطر میں تھا اس لئے بریدنے مجبوراً گولکنڈہ کا محاصرہ اٹھا لیا اور کوہیر کو بچانے کے لئے بھاگا۔ اس طریقہ سے گولکنڈہ بال بال بچ گیا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ بریدنے بھاگتے ہوئے ابراہیم کے گھوڑے اور ہاتھی اور دیگر سامان خود سمیٹ لئے اور مغرب کی راہ لی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت اس کو ابراہیم سے کوئی کام نہ تھا وہ اپنے مطلب کے لئے گولکنڈہ آیا تھا۔

ابراہیم کا بیجانگر بھاگنا

جب ابراہیم کی کوششیں گولکنڈہ کی ہمسایہ اسلامی طاقتوں سے بارور نہ ہو سکیں بلکہ برید کے طرزِ عمل سے اس کا پانسہ اُلٹا پڑا تو اس کے سامنے بالآخر ویجیانگر کے سوا کوئی اور پناہ گاہ نہ تھی بیدر سے اب کوئی توقع نہ تھی۔ احمد نگر کا یہ حال تھا کہ شاہ طاہر کے اثر سے یہ جمشید کی مدد پر تیار تھا۔ بیجاپور کی سیاست یوسف عادل شاہ کے انتقال کے بعد اس قدر منتشر ہو گئی تھی کہ یہ بھی امداد کے قابل نہ تھی۔ اس طرح یہ قدرتی بات تھی کہ ان حالات میں ابراہیم کی دور بیں نظر دریائے تنگ بھدرا کے پیچھے پڑی۔ اگرچہ سلطنت بہمنی اور سلطنت وجیانگر دونوں ایک ہی زمانہ میں قائم ہوئی تھیں لیکن آخر الذکر سلطنت میں کچھ ایسی استقامت تھی کہ گو سلطنت بہمنی کا شیرازہ بکھر چکا تھا لیکن یہ جنوبی ہند میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قائم تھی۔ اس زمانہ میں اس سلطنت کا مشہور راجہ رام راج جس کو دکن کے مورخ رائے اعظم کے نام سے یاد کرتے ہیں اپنے زمانہ کا بڑا اقبال مند

---

[1] تاریخ قطب شاہی صفحہ ۱۰۹

راجہ تھا۔ اگر قطب شاہی مورخوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ رام راج کبھی گولکنڈہ کے جاگیردار اور سلطان قلی کا ملازم تھا تو ابراہیم کے لئے اس سے بہتر پناہ گاہ نہ تھی۔ رام راج ابراہیم سے ضرور واقف ہوگا اور اسی وجہ سے اس کے ہمدردوں نے اس کو وجیانگر کی طرف بھاگنے کی صلاح دی تھی۔

ابراہیم کا وجیانگر بھاگنا اچھا منصوبہ ضرور تھا لیکن پائے تخت تک اس کی رسائی آسان نہ تھی۔ دشمن چاروں طرف گھات میں لگے ہوئے تھے جمشید کی فوجیں تعاقب میں لگی ہوئی تھیں جمشید کو یہ ڈر تھا کہ اگر شاہزادہ ابراہیم ہاتھ سے نکل جائے تو یہ ہمیشہ کے لئے تنگ راہ ہوگا اور اس کو کبھی با امن زندگی نصیب نہ ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادہ ابراہیم فوجی تعاقب سے تو بچ گیا تھا لیکن جنوبی فاصلہ طے کر کے جب دریائے تنگ بھدرا عبور کرنے لگا تو اس کو دوسرے دشمنوں سے سابقہ پڑا۔ جمشید نے ابراہیم کا راستہ روکنے کے لئے ان رہزنوں سے کام لیا تھا جو جنگل اور دریاؤں کی وادیوں کو اپنا مامن بنائے ہوئے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دریائے تنگ بھدرا کی وادی میں ان دنوں نارائن راما پنڈت نامی رہزنوں کا ایک سردار اپنا قدم جمائے ہوئے تھا اور یہ دونوں سلطنتوں کی درمیانی حدود میں خود مختار حیثیت رکھتا تھا۔ اس موقعہ پر یہ جمشید قطب شاہ کا معاون ثابت ہوا۔ اس نے ابراہیم کے تمام راستے بند کر دیئے اور جمشید کو ان مفرورین کی اطلاع کر دی۔ جمشید کے لئے یہ اچھا موقعہ تھا۔ اس نے پانچ ہزار ہن اور شاہی خلعت وغیرہ جلیب خاں کے بھائی تغزشخان کے ہمراہ راما پنڈت کے پاس بھیج دیئے۔ نیز ایک ہاتھی اور دو

---

۵ تاریخ قطب شاہی صفحہ ۱۱۱ تاریخ قطبیہ صفحہ ۳

دو سوار روانہ کیے[1]۔ اس شاہی حوصلہ افزائی سے اما پنڈت کی طاقت بہت بڑھ گئی اور گولکنڈہ کے پناہ گزینوں کے لئے صورت حال بہت نازک تھی۔ تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے کہ حمید خاں اور سید جی نے اس مقابلہ میں اپنے کو بے بس پا کر رام راج کو اپنے آنے کی خبر دی۔ اس اطلاع پر رام راج فوراً امداد کے لئے کھڑا ہو گیا اور پنڈت کو لکھا کہ شاہزادہ ابراہیم کو چھوڑ دیا جائے ورنہ تجھ پر حملہ کر کے تیرا سر تن سے جدا کر دیا جائے گا۔ اس فرمان سے ڈر کر پنڈت نے ابراہیم کو چھوڑ دیا[2]۔ یہ پناہ گزیں دریا عبور کر کے بیجانگر پہنچ گئے۔ یہ بات سمجھنا مشکل ہے کہ ان نازک حالات میں ان لوگوں کو بیجانگر سے مراسلت کرنے کا کس طرح موقعہ ملا ہوگا۔ ممکن ہے ان لوگوں نے اما پنڈت کی مزاحمت سے ڈر کر شب کی تاریکی میں راستہ پیدا کر لیا ہو اور جمشید کی فوج بعد کو پہنچی ہو۔ بیجانگر پہنچنے سے پہلے ان پر ضرور بدحواسی طاری ہو گی۔ لیکن رام راج کی غیر معمولی آؤ بھگت نے تمام حالات بدل دیئے۔ تاریخ قطب شاہی کا بیان صحیح سمجھا جائے تو پہلے رام راج نے شاہزادہ ابراہیم کے استقبال کے لئے اکابر سلطنت کو جن میں اس کے عزیز و اقارب شامل تھے آگے بھیجا اور یہ لوگ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کو نہایت احترام کے ساتھ شہر میں لائے اور جب ابراہیم شہر میں پہنچا تو رام راج نے اس کی غیر معمولی عزت کی اور اپنے برابر میں تخت پر بٹھایا اور ایسی مدارات کی جو ایک ولی نعمت زادہ کے ساتھ کرنی چاہیے[3]۔

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص۱۱۱

[2] تاریخ قطب شاہی ص۱۱۱

[3] تاریخ قطب شاہی ص۱۱۱

ابراہیم قطب شاہ وجیانگر میں

ابراہیم کو اپنے بھائی جمشید کے انتقال تک وجیانگر میں سات سال رہنا پڑا تھا۔ یہ سات سال کی جلاوطنی ابراہیم کی زندگی کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔ ممکن ہے کہ رام راج برید کی طرح گولکنڈہ کی مخالفت کے ضروری سامان جمع کرنا چاہتا ہو اور اسی وجہ سے اس نے ابراہیم کے ساتھ غیر معمولی مدارات سے کام لیا تھا لیکن اس میں خود ابراہیم کی قابلیت اور سلیقہ کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ اسباب کچھ بھی ہوں وجیانگر کی جلاوطنی ابراہیم کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ یہاں اس کی نہ صرف جان بچ گئی بلکہ حصول سلطنت کی بہت سی راہیں پیدا ہو گئیں ایک ایسے شخص کے لئے جو دکن کی ایک بڑی سلطنت کا ناخدا ہونے والا تھا۔ بیجانگر کی سی بڑی سلطنت اور اس کا سیاسی ماحول بہت کچھ مطالعہ کے قابل تھا۔ بیجانگر کے سیاسی رکھ رکھاؤ اور اس کا تمدن جو عبدالرزاق ایرانی کے سیاحت نامہ سے واضح ہوتا ہے اپنے میں بڑی کشش رکھتا تھا اور فرشتہ کے قول کے مطابق خود بہمنی سلاطین بھی اپنے زمانے میں اس سلطنت کو دیکھنے کے متمنی رہتے تھے۔ چنانچہ مجاہد شاہ بہمنی اپنے حملہ کے دوران میں بیجانگر کو بچشم خود دیکھنے کے لئے گیا تھا[1]۔ کچھ عجب نہیں کہ ابراہیم قطب شاہ نے یہاں سیاست اور عمرانیت کے بیشمار سبق سیکھے ہوں جو اس کے درخشاں عہد حکومت سے ظاہر ہوتے ہیں گولکنڈہ کی تمام سیاست جس مسالہ سے تیار کی گئی تھی اس میں اسلامی عناصر کے ساتھ تلنگانہ اور کرناٹک کے بہت کچھ عناصر شامل تھے اور اسی وجہ سے یہ سلطنت تلنگانہ کی جغرافی اور قومی خصوصیات کے ساتھ کچھ ایسی پیوست ہو گئی تھی کہ اہل تلنگانہ اس کو اپنی سلطنت سمجھنے تھے۔ تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے شاہزادہ ابراہیم کو بیجانگر میں بہت سے واقعات پیش

---

[1] فرشتہ مقالہ سوم ۲۹۷۔

آئے تھے۔ منجملہ ان کے عین الملک کنعانی کا واقعہ ہے۔[1] یہ شخص بیجاپور کے بڑے امراء میں سے تھا لیکن بعض اسباب کی بنا پر جو اس کی روگردانی کے باعث ہوئے تھے یہ بیجانگر کا ملازم ہوگیا تھا۔ چونکہ یہ ایسا دلیر سپاہی تھا اور اس کے ساتھ چار ہزار سوار و فوج تھی اس لئے رام راج اس کی بڑی قدر کرتا تھا اور اس کو اپنا بھائی کہتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز عین الملک رائے اعظم سے مل کر دربار سے گھر واپس جا رہا تھا کہ راستہ میں شاہزادہ ابراہیم کے ساتھ مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ حمید خاں اور سیدی جی شاہزادہ کے ساتھ تھے۔ راستہ بہت تنگ تھا دونوں طاقتیں وقت واحد میں راستہ سے گذرنا چاہتی تھیں۔ قرون وسطیٰ کا جذبہ شجاعت اس بات کو گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ ایک فریق دوسرے کے مقابلہ میں ہتھیار ڈال دے اور چپ چاپ راستہ دے دے۔ عین الملک کے ساتھ اس کا پورا دستہ فوج تھا۔ حمید خاں اور سیدی جی نے کہا کہ دکن کے رواج کے مطابق دشمن کا مقابلہ کرکے راستہ پیدا کرنا ضروری ہے ورنہ کمزوری سمجھی جائے گی چنانچہ تاریخ کا بیان یہ ہے کہ ابراہیم کے مٹھی بھر آدمیوں نے لڑ لڑا کر راستہ نکال لیا اور رام راج کے پاس پہنچ گئے۔ رام راج نے ان کی دلاوری کی بڑی داد دی لیکن عین الملک انتقام کے لئے اسی جگہ کھڑا رہا۔ تاکہ جب ابراہیم دربار سے لوٹے تو اس کا مقابلہ کیا جائے جب رام راج کو معلوم ہوا تو اس نے عین الملک کے نام احکام بھیجے کہ وہاں سے چلا جائے اور جب وہ اس کے بعد بھی نہیں گیا تو تہدیدی احکام بھیجے گئے اور دھمکی دی گئی کہ وہ بیجانگر سے نکال دیا جائے گا۔ اسی دھمکی کے بعد وہ وہاں سے ٹلا۔ فرشتہ عین الملک کا نام عنبر خاں بتاتا ہے۔ ممکن ہے عین الملک کا نام عنبر خاں ہو۔ لیکن اس کا مزید بیان یہ ہے

---

[1] تاریخ قطب شاہی - ۱۱۱

کہ اسباب مخالفت صرف راستہ تک محدود نہ تھے بلکہ رام راج نے عنبر خاں کی جاگیر کے اکثر حصے ابراہیم کی ضروریات کے لئے دے رکھے تھے، اس وجہ سے عنبر خاں ابراہیم کا مخالف ہو گیا تھا۔ جب راستہ میں مڈبھیڑ ہو گئی تو سخت کلامی کے ساتھ لڑائی ٹھن گئی، اور اس لڑائی میں ابراہیم نے عنبر خاں کو اپنے خنجر کے وار سے قتل کر دیا۔ اور اس کے بھائی جو انتقام کے لئے آئے تو ان کا بھی یہی حشر ہوا۔ نیز فرشتہ نے ایک دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ اس لڑائی میں ابراہیم نے عنبر خاں کا علم جس کو دکن میں برقا کہتے ہیں حاصل کر لیا تھا اور اس کو اپنا نشان فتح سمجھ کر گولکنڈہ لے گیا تھا اور اسی کو اپنی سلطنت کا پرچم بنایا تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ابراہیم کی اولوالعزم زندگی اس چھوٹی سی جھڑپ اور اس کی کامیابی کو کہاں تک اپنا سرمایہ حیات سمجھتی تھی۔ گولکنڈہ کی تاریخوں سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

جمشید قطب شاہ کا انتقال اور گولکنڈہ کا سیاسی انتشار

۹۵۷ھ میں جمشید قطب شاہ کا انتقال ہوا۔ اس کا سات سالہ عہد حکومت گولکنڈہ کی تاریخ کا ایک تاریک دور ہے۔ اول تو جمشید کے ہاتھ دو بڑی ہستیوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے جن میں اس کے باپ اور بھائی شامل ہیں اور یہ ایسا بھیانک واقعہ تھا کہ اہل گولکنڈہ جمشید سے کبھی خوش نہیں ہو سکتے تھے۔ باپ کی خونریزی جمشید کی زندگی کو بہت تاریک بنائے ہوئے تھی۔ دوسرے اس کا بڑے بھائی کو بے دست و پا کر کے محروم تخت کر دینا دوسرا شنیع فعل تھا جس نے جمشید کو عمر بھر تک بدنام رکھا اصل ولیعہد سلطنت قطب الدین کی گولکنڈہ میں اس کے پاکیزہ خصائل کی وجہ سے بڑی

لہ تاریخ فرشتہ روضہ چہارم ۱۷۰۔

عزت تھی۔ ایسے شخص کا تخت سے محروم ہو جانا جس کے ساتھ اہل سلطنت کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں اہل گولکنڈہ کے لئے ایک سوہان روح تھا جمشید قطب شاہ کا ہر نظارہ ان شنیع واقعات کو آنکھوں کے سامنے لاتا تھا اور اس طریقہ سے راعی و رعایا کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں ہو سکے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں ایک بددلی پھیلی ہوئی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ جمشید قطب شاہ کی ابتدائی زندگی جو بہت تنگ احوال میں گذری تھی اس کو سخت ترش رو اور بدخلق بنائے ہوئے تھی چونکہ اوائل عمر سے اس کا رویہ مخدوش تھا اس لئے یہ سخت قید و بند میں رکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ تنگ اور سخت احوال انسان کو کبھی فراخدل نہیں رکھ سکتا۔ آخری عمر میں تو وہ بہت تنگ دل اور جابر ہو گیا تھا اور اگر فرشتہ کا قول صحیح مان لیا جائے تو معمولی معمولی باتوں پر لوگوں کو قتل و قید کر دیتا تھا[1]۔ گو اس میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے تاہم اس کی جابرانہ طبیعت اور بدخلقی سے انکار نہیں کیا جا سکتا جو اس کے ابتدائی احوال کا قدرتی نتیجہ تھا۔ جب اس کی زندگی میں یہ نتیجہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس کے انتقال کے بعد گولکنڈہ کے ارباب سیاست اس کے پسماندگان سے کیا ہمدردی کر سکتے تھے۔ چنانچہ ۹۵۰ھ میں جمشید کا انتقال ہوتے ہی گولکنڈہ میں ایک سیاسی افراتفری مچ گئی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ کمزور طنابیں جو جمشید کے عہد میں اجزائے مملکت کو کسی قدر مربوط کئے ہوئے تھیں اس کے مرتے ہی منتشر ہونے لگیں اور گولکنڈہ کی سلطنت چند روز کی مہمان معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ ان حالات میں شاہی محل نے بڑا حصہ لیا۔ مرحوم بادشاہ کی بیوی بلقیس زماں اور خدیجہ دوراں نے بعض عمائد سلطنت سے مشورہ کر کے جمشید کے بیٹے کو

---

[1] فرشتہ۔ ۱۶۹

تخت نشین کرنے کی کوشش کی۔

جن لوگوں نے بلقیس زماں کے ساتھ اتفاق کیا تھا وہ فرشتہ کے الفاظ میں مصطفیٰ خاں اردستانی۔ صلابت خاں غلام ترک اور دیگر عمائد تھے جمشید کا بیٹا سبحان قلی جو اس وقت سلطنت کے لئے نامزد کیا گیا اس قدر چھوٹا تھا کہ گولکنڈہ کے اکثر مدبر اس کے لئے تیار نہ تھے۔ تاریخ قطب شاہی میں اس لڑکے کی عمر ۷ سال بتائی جاتی ہے۔ فرشتہ کا بیان یہ ہے کہ وہ صرف دو سال کا شیر خوار بچہ تھا[1] گو یہ عمر صحیح نہیں ہے لیکن ۷ سال کی عمر میں بھی وہ حکومت کے قابل نہ تھا۔ اس لئے جب سبحان قلی تخت نشین کیا گیا تو اس کی کمی کو پورا کرنے کے لئے بلقیس زماں نے سیف خاں عین الملک کو احمد نگر سے بلا کر وکالت اور پیشوائی کی خدمت جلیلہ تفویض کرنے کی کوشش کی تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے کہ یہ سیف خاں گولکنڈہ کا پرانا متوسل تھا بلکہ شاہی خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ لیکن جمشید قطب شاہ کے طرز عمل سے بیزار ہو کر احمد نگر کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اس وقت یہ کوشش کی گئی کہ سبحان قلی کے سن رشد کو پہنچنے تک عین الملک کی مدد سے حالات بدستور رکھے جائیں اور امور سلطنت خوش اسلوبی سے انجام پائیں[2]۔

دولت قلی کی بادشاہی کا اعلان

ان حالات میں اگر سبحان قلی اچھی عمر کا ہوتا تو غالباً جمشیدی دور حسب حال رہتا۔ لیکن اس کی کمسنی کی وجہ سے ارباب سیاست کا ایک بڑا طبقہ اس حکومت کا مخالف تھا۔ جگدیو راؤ۔ جگپت رائو بجری خاں اور جملۃ الملک اس زمانے کے بڑے عمائد تھے اور

---

[1] فرشتہ مقالہ سوم ۱۷۰۔

[2] تاریخ قطب شاہی ۱۳۰

ان میں جگدیو راؤ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ یہ سبحان قلی کا دشمن بھی تھا بلکہ اس کی کمسنی کے ڈر کر دوسرے ورثا کو تخت دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں جبکہ سبحان قلی کی رسم تخت نشینی ادا ہو رہی تھی اور سیف خاں عین الملک ابھی احمد نگر سے نہیں آیا تھا یہ عمائد سلطنت اپنے منصوبہ کی تحت و پز کرنے لگے اور یہ کوشش کی کہ سیف خاں کے آنے سے پہلے اپنے منصوبہ کی تکمیل کر لیں جگدیو راؤ نے اپنے ساتھیوں کو دولت قلی کے لئے آمادہ کیا۔ یہ منصوبہ اس طرح اچھا تھا کہ دولت قلی کی عمر اس وقت کافی تھی اور سبحان قلی کے مقابلہ میں یہ زیادہ لائق سلطنت تھا اور شاہزادہ ابراہیم کے مقابلہ میں قریب تھا یعنی بھونگیر کے قلعہ میں قید تھا لیکن ابراہیم کے مقابلہ میں اسے کوئی اہمیت نہ تھی۔ ابراہیم زیادہ لائق تھا اس کو بھیجنے سے ذمہ دارانہ کام تفویض کئے گئے تھے اور دولت قلی اپنی بداعمالی کی بنا پر سلطان قلی قطب شاہ کے عہد سے قید تھا اور جمشید کے عہد میں تو اس کی قید اور بھی سخت کر دی گئی تھی اور ملک میں اس کے اکثر ہمدرد بھی نہ تھے بلکہ اس وقت ملک کا کوئی طبقہ اس کی تائید کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس طریقہ سے جگدیو اور اس کے شرکا رکار بجائے دولت قلی کے شاہزادہ ابراہیم کو اپنا سرگرم حامی بناتے تو بہتر تھا۔ اس طرح نہ صرف سلطنت کو اچھا آدمی حاصل ہو جاتا جو درحقیقت قدرت کی جانب سے ودیعت کیا گیا تھا۔ اس طریقہ سے کئی خانہ جنگیوں کا سدباب ہو جاتا جو ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت ہونے والی تھیں۔ کیونکہ سبحان قلی اور اس کے ہمدرد سیف خاں عین الملک کی طاقت کے مقابلہ میں دولت قلی کو بھونگیر کے قلعہ سے باہر نکال کر تخت نشین کرنا آسان نہ تھا۔ اس کوشش میں خانہ جنگی کا امکان ہو گیا اور سیف خاں کے آنے سے پہلے جگدیو راؤ اپنی طاقت کے ساتھ بھونگیر پہنچ گیا۔ قلعہ کی فوج اور

ناگواڑیوں کو اپنے ساتھ ہموار کر لیا اور قلعہ دار کو اپنے ساتھ شریک کر کے دولت قلی کو قید سے باہر نکالا۔ بھونگیر میں اس کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ نیز تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے کہ اس نے اپنے ہاتھ پیر مضبوط کرنے کے لئے بھونگیر کے آس پاس کئی قلعے فتح کر لئے تھے اور اپنا قدم جالیا تھا۔[1] اب جگدیو راؤ کو عین الملک کا سخت مقابلہ کرنا تھا لیکن اس دوران میں سیف خاں عین الملک گولکنڈہ پہنچ گیا تھا کچھ تو سبحان قلی اور اس کی ماں بلقیس زماں کی تائید اور کچھ اپنے اقتدار کے بچاؤ کے لئے عین الملک کا فرض تھا کہ جگدیو راؤ اور اس کے اُمیدوار دولت قلی کو مغلوب کرے۔ چنانچہ اس کام کے لئے گولکنڈہ کی بڑی فوج ترتیب دی گئی اور سیف خاں کی سرکردگی میں اس کی نقل وحرکت شروع ہوئی اگرچہ جگدیو راؤ اس وقت کئی قلعوں پر قابض تھا لیکن گولکنڈہ کی شاہی فوج کا مقابلہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نقل وحرکت سے گھبرا کر جگدیو راؤ نے قریب کی عماد شاہی سلطنت سے مدد مانگی۔ ظاہر ہے کہ دکن کی باہمی رقابت ہمیشہ ایسی امداد کے لئے تیار رہتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ عماد شاہی سلطنت کا مشہور سپہ سالار تفال خاں جگدیو راؤ کی امداد کے لئے آگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیف خاں نے اس فوج کا راستہ روکنے کی کوشش کی تاکہ وہ بھونگیر نہ پہنچ سکے اور جگدیو راؤ کی طاقت نہ بڑھے سیف خاں کی یہ تدبیر کامیاب ہوگئی۔ عماد شاہی فوج شمال سے بھونگیر کی طرف پیشقدمی کر رہی تھی کہ سیف خاں نے گولکنڈہ سے بڑھ کر موضع سنگرم[2] پر اس کا راستہ روکا اور اس موقع پر جو گھمسان کا معرکہ ہوا ہے وہ تاریخ قطب شاہی کے الفاظ میں

---

[1] تاریخ قطب شاہی ۱۳۱۔

[2] موضع سنگرم کریم نگر سے جانب جنوب ۹ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کے اردگرد پہاڑیاں ہیں۔

"در ہیچ زمان سلاطین و بادشاہ عظیم الشان بداں مشابہ کارزارے نشان ندادہ اند"[۱]

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی سخت لڑائی تھی اور اس میں طرفین کے بیشمار سپاہی کام آئے تھے عین الملک کامیاب ہوگیا اور یہ پیشقدمی اس قدر معقول تھی کہ اس کے بعد قلعہ بھونگیر میں جگدیو راؤ کی منفرد طاقت کا مقابلہ کرنا اس کے لئے بہت آسان تھا۔ تفال کی منہزم فوج نے بھونگیر کی طرف راہ فرار اختیار کی تو عین الملک نے اس کا تعاقب کیا بھونگیر کے قلعہ کے سامنے کھڑا ہوگیا اور قلعہ کا محاصرہ شروع کر دیا تفال خاں کی منہزم فوج قلعہ کے اندر محصور ہوگئی تھی۔ چونکہ بھونگیر کا قلعہ ایک پہاڑ پر واقع ہے اور محصورین کو قلعہ پر سے وار کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ جگدیو راؤ کے حملوں سے عین الملک کی فوجوں کو بہت نقصان پہنچنے لگا اور اس قدر سخت نقصان پہنچے کہ تاریخ قطب شاہی کے الفاظ میں عین الملک نے صلح کرنے کی کوشش کی لیکن جگدیو راؤ نے صلح سے انکار کر دیا۔ حالانکہ جگدیو راؤ کے لئے یہ اچھا موقعہ تھا۔ اس انکار سے عین الملک نے محاصرہ اور سخت کر دیا جو گولکنڈہ کی آیندہ تاریخ کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اگر صلح ہو جاتی تو ظاہر ہے کہ سلطنت گولکنڈہ کے دو حصے ہو جاتے۔ ایک مہینہ کے محاصرہ کے بعد محصورین کی رسد گھٹنے لگی اور یہ اپنی رسد سے اس قدر تنگ ہوئے کہ بالآخر جگدیو راؤ اور دولت قلی نے قلعہ کے دروازے کھول دیئے اور عین الملک سے امان طلب کی۔ لیکن دولت قلی کی قسمت میں عمر بھر کی قید لکھی تھی وہ پھر قید کر دیا گیا اور جگدیو راؤ کو پا بہ زنجیر کر کے گولکنڈہ کے قلعہ میں مقید کر دیا گیا۔

---

[۱] تاریخ قطب شاہی ۱۳۱

عین الملک کی کامیابی سے ایک خانہ جنگی کا خاتمہ تو ہو گیا لیکن آئندہ حالات نے سیاسی فضا کو اور پیچیدہ بنایا۔ یہ پیچیدگی ابراہیم کے لئے فائدہ سے خالی نہ تھی جب عین الملک بھونگیر کے معرکہ سے واپس ہوا تو اپنی اس کامیابی اور اپنے غیر معمولی اقتدار کے باعث بہت مغرور ہو گیا اور گولکنڈہ کے عمائد اور خاندانی امرا کے ساتھ جابرانہ برتاؤ کرنے لگا۔ اس سے تمام امرا و عمائد سلطنت مکدر ہونے لگے اور سب کی نظر ابراہیم قطب شاہ پر پڑنے لگی۔ فرشتہ ان تمام واقعات کو حذف کر کے اہل گولکنڈہ کی شورش پر زور دیتا ہے جو سبحان قلی کی تخت نشینی کے بعد ہوئی تھی[۱]۔ شورش ضرور ہوئی تھی لیکن سبحان قلی کی تخت نشینی کی وجہ سے نہیں بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب عین الملک کا ناجائز برتاؤ اور جابرانہ سلوک تھا جس سے متنفر ہو کر اہل گولکنڈہ نے محل پر حملہ کر کے دولت خانہ لوٹ لیا تھا۔ تذکرۃ الملوک کا بیان ہے کہ عین الملک نے طفل سلطنت کو بالائے طاق کر کے اختیارات خود حاصل کر لئے تھے[۲]۔ ظاہر ہے کہ یہ حالات ایک نئے انقلاب کے متقاضی تھے۔ جن توقعات سے مصطفیٰ خاں اور صلابت خاں سبحان قلی کی بادشاہی کے لئے تیار ہوئے تھے وہ اب پادر ہوا ہو کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ ان سنجیدہ شخصیتوں کے سامنے جو ملک کے حقیقی بہی خواہ تھے سوائے شاہزادہ ابراہیم کے اور کوئی مرجع امید باقی نہیں تھا۔ حکومت کے ممکنہ تجربے ہو چکے تھے سلطنت کے تمام امیدواروں کو آزمایا گیا تھا۔ جو لائق شخصیتیں امور سلطنت کی اہل سمجھی گئی تھیں وہ غدار ثابت ہوئیں تھیں۔ اس لئے ان تمام تجربوں کے بعد یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت سلطنت گولکنڈہ کے لئے شاہزادہ

---

[۱] تاریخ فرشتہ روضہ چہارم ۱۷۰

[۲] تذکرہ الملوک خانی ۱۷۰

ابراہیم ہی تنہا ناخدائے سیاست ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مصطفیٰ خاں اور صلابت خاں نے فوراً ابراہیم کو گولکنڈہ آنے کی دعوت دی ۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر اس وقت ابراہیم نہ آئے تو گولکنڈہ خانہ جنگیوں کا شکار ہو کر منتشر ہو جائے گا۔ مصطفیٰ خاں کی اس جنبش پر دیگر عمائد بھی چپکے چپکے اتفاق کرنے لگے اور ابراہیم کو اپنے ارادہ سے واقفت کرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے دنوں میں ابراہیم کی خدمت میں کئی عرائض پہنچ گئے کہ گولکنڈہ سبحان قلی کی بادشاہی سے راضی نہیں ہے اور سیف خاں عین الملک نے امرا کو تنگ کر رکھا ہے عین الملک اور جگدیو راؤ کی باہمی کشمکش سے ملک کو علیٰحدہ نقصان پہنچ رہا ہے اس لئے اس وقت ملک کی نجات آپ کے ہاتھ میں ہے[1] عجیب اتفاق ہے کہ جو جنبش مرکزی حکومت میں ہو رہی تھی وہ بہت جلد ملک کے دوسرے گوشوں میں بھی محسوس ہونے لگی۔ ابھی ابراہیم بیجانگر سے نکلا نہیں تھا کہ گولکنڈہ کے باشندوں نے اس موقعہ پر ابراہیم کی مدد کرنا اپنا فرض عین سمجھا۔ گولکنڈہ کے قلعہ میں حال میں جو کتبہ دریافت ہوا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اہل گولکنڈہ نے اپنے طور پر ابراہیم کو مدد دینے کی تیاری کی تھی۔ کتبہ میں دو نام آتے ہیں ایک پدمیاں دوسرے سیدعلی میاں[2] جو اس پاکیزہ منصوبے کے علمبردار تھے۔ ان لوگوں نے گولکنڈہ کے تمام سپاہی اور عہدہ داروں سے ابراہیم کی تائید کا سخت وعدہ لیا اور قسم لی کہ وہ ابراہیم کے معاملہ میں سبحان قلی اور دولت قلی کی تائید نہ کریں گے۔ جب اس طرح تیاری ہو گئی تو انھوں نے ابراہیم کو اپنے پاس بلایا تھا کہ گولکنڈہ کی ان پڑھ آبادی میں سلطنت کی بہبودی

۱؎ تاریخ قطب شاہی ۱۳۳

۲؎ [illegible] آثار قدیمہ ۱۳۳۳ف

کا یہ احساس اور مردم شناسی حیرت سے خالی نہیں ہے کہ ان لوگوں نے سلطنت گولکنڈہ کے مستقبل کا لحاظ کر کے دوسرے دعویداران سلطنت کو نظر انداز کر دیا تھا شاہزادہ ابراہیم کو ترجیح دی تھی۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کو بھی حکومت کی سازش سے ضرور فائدہ پہنچا تھا لیکن گولکنڈہ کی امداد کو بھی جو بروقت حاصل ہوئی تھی کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ابراہیم کی تمام پیشقدمی جو پانگل سے شروع ہوئی تھی، اہل گولکنڈہ کی امداد پر منحصر تھی۔ ابراہیم نے اسی جگہ اپنے ہاتھ پیر مضبوط کئے تھے اور یہاں اس کو اس قدر اعتماد ہو گیا تھا کہ اس نے بلا کھٹکے مرکزی حکومت کا رخ کیا اور تخت پر قبضہ کر لیا۔

ابراہیم قطب شاہ کی نقل و حرکت

جب گولکنڈہ سے مختلف عرائض ابراہیم کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے ہمدردوں کے مشورہ سے جو سید جی، خان اعظم اور حمید خاں تھے گولکنڈہ کو کوچ کی تیاری شروع کر دی۔ قدرت نے ابراہیم کے لئے خاص حالات پیدا کر دیے تھے جو اس کے حصول سلطنت کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے۔ ورنہ جمشید قطب شاہ کی اس قدر جلد موت واقع نہ ہوتی اور سبحان قلی اور اس کے ارباب سیاست مفید مطلب ثابت ہوتے تو ظاہر ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کو گولکنڈہ کی سلطنت حاصل کرنے کا موقع نہ ملتا۔ ظاہر ہے کہ جب ابراہیم بیجانگر کی طرف بھاگا تھا تو اس کے ذہن میں حصول سلطنت کی کوئی امید نہ ہوگی اور نہ ان حالات کا وہم و گمان ہوگا۔ ان تمام سازشوں کے باوجود جو اس کی تائید میں پختہ ہو گئی تھیں کئی مشکلات باقی تھیں۔ اور گولکنڈہ پہنچ کر تخت سلطنت پر قدم رکھنے تک مختلف زحمتوں کا سامنا کرنا تھا اور یہ مشکلات اسی کو اور اس کے

ساتھیوں کو ضرور ڈراتی ہوں گی اور بعضوں نے عزم گول کنڈہ کی مخالفت کی ہو گی۔
رام راج کی مخالفت تو تاریخ سے معلوم ہوتی ہے جو در حقیقت ہمدردی پر مبنی تھی آیندہ
خطرات کی پیشبندی کرکے جو حصول سلطنت کے راستہ میں حائل تھے رام راج ابراہیم کی
پیشقدمی نامناسب سمجھتا تھا۔ لیکن ابراہیم کی اولوالعزمی ہر خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے
تیار تھی اور اس کے ساتھی حمید خاں اور سید جی بھی جنھوں نے اپنی تمام عمر ابراہیم کی خدمت
کیلئے وقف کر دی تھی۔ ہر خطرہ کے لئے آمادہ تھے اور انھوں نے نہایت جرأت کے
ساتھ شاہزادہ کو نقل و حرکت کے لئے کھڑا کر دیا۔ اس طریقہ سے جب یہ جلا وطن گولکنڈہ
تک سفر کے لئے آمادہ ہو گئے تو رام راج نے اپنے دیرینہ روابط اور وفا شعاری کے لحاظ
سے شاہزادہ ابراہیم کی مدد کرنا چاہی چنانچہ تاریخ قطب شاہی کے بیان کے مطابق
اس نے اپنے بھائی تکنا رائے کی سرکردگی میں دس ہزار سوار اور بیس ہزار پیدل کی
بڑی فوج پیش کی اور شاہزادہ کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔ لیکن حمید خاں اور سید جی
کی حمیت نے اس امداد کو گوارہ نہیں کیا۔ انھوں نے یہ امداد لینے سے انکار کر دیا اور شاہزادہ
کو ان الفاظ سے مخاطب کیا کہ ہم کو اپنے پیر پر کھڑے ہونے کے لئے تیار رہنا چاہئے[1]
چنانچہ تاریخ کہتی ہے کہ یہ لوگ رام راج کی امداد کے بغیر آمادہ سفر ہو گئے۔

ابراہیم قطب شاہ کا سفر

ابراہیم قطب شاہ اور اس کے ساتھی بیجانگر سے کوچ کرکے سب سے پہلے پانگل پہنچے تھے جو اس
زمانہ میں سلطنت بیجانگر کے حدود میں شامل تھا تلنگانہ کی سرحد پر ہونے کی
وجہ سے یہ ایسا مقام تھا جہاں تلنگانہ کے تمام سیاسی ماحول کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا تھا

---

[1] تاریخ قطب شاہی۔ ۱۲۳۔۱۲۴۔

اور عجیب اتفاق ہے کہ یہاں ہر حرکت کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی۔ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں نے یہاں چند روز قیام کرکے دور سے تمام سیاسی فضا کا مطالعہ کیا اور یہ دریافت کیا کہ ملک میں ان کا کہاں تک خیر مقدم ہو سکتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس موقعہ پر ابراہیم نے سیاسی دور اندیشی کی بڑی مثال قائم کی تھی کہ پہلے دور سے ملک کی نبض شناسی کر لی۔ ورنہ بغیر موقعہ شناسی کے کہ ملک مدد کے لئے تیار ہے یا نہیں میدان میں کود پڑنا تدبر سے بعید تھا۔ چنانچہ پانگل سے اس نے تمام تلنگانہ میں اپنے آنے کی خبر پہنچا دی۔ اور یہ

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید نوید فتح و بشارت بہ مہر و ماہ رسید
جمال بخت ز روئے ظفر نقاب انداخت کمال عدل بہ فریاد داد خواہ رسید

جب لاسلکی پیاموں کی طرح اس کی آمد کی خبریں دور دور پہنچنے لگیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام تلنگانہ کے طول و عرض میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور لوگ جوق جوق اپنے نئے بادشاہ کی دید کے لئے ایسے والہانہ آنے لگے کہ گویا اس کے خیر مقدم کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ابراہیم کے ارد گرد تین ہزار سوار اور پانچ ہزار پیدل جمع ہو گئے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ اسی جگہ اس کو گولکنڈہ کی غیبی امداد کی خوشخبری پہنچائی گئی۔ فرشتہ کا بیان[1] ہے کہ جب ابراہیم کی جماعت تلنگانہ کی سرحد پر پہنچی ہے تو سب سے پہلے مصطفیٰ خاں اس سے آ کر ملا۔ اور ابراہیم نے اس کی قابلیت اور اعلیٰ خدمات کا اعتراف کر کے اس کو میر جملہ کی خدمت عطا کی اور کچھ ایسا مصطفیٰ خاں کا اثر تھا کہ لوگ ابراہیم کی بادشاہی کے لئے راضی ہو گئے

---

[1] تاریخ قطب شاہی ۱۳۵۔

اور اس نے ہندو تاجروں سے دو لاکھ ہون قرض لے کر ضروری مصارف کا انتظام کیا تھا۔[5] ممکن ہے کہ مصطفیٰ خاں کی ملاقات پانگل میں ہوئی ہو اور اسی جگہ اس کو میر جملگی کی خلعت عطا ہوئی ہو لیکن یہ کہنا کہ اہل تلنگانہ محض مصطفیٰ خاں کے اثر سے ابراہیم کی بادشاہی کے لیے تیار ہوئے تھے صحیح نہیں ہے۔ گو مصطفیٰ خاں کی سیاسی اور مالی امداد سے جو بروقت ہوئی تھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ گو کلکنڈہ کی تمام سازش اسی کی بنائی ہوئی تھی اور ممکن ہے کہ گولکنڈہ کے اہم اتفاق میں بھی اس کا ہاتھ ہو لیکن اس بات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اس تمام سیاسی ہل چل میں خود ابراہیم کی زبردست شخصیت بھی اپنا کام کر رہی تھی اور دوسرے دعویٰ داران سلطنت کے مقابلہ میں اپنا لوہا منواتی تھی۔ مصطفیٰ خاں کے بعد صلابت خاں بھی تین ہزار فوج کے ساتھ ابراہیم کی امداد کے لیے یہاں آ گیا اور اس کے پیچھے کئی امرا سبحان قلی کی رفاقت چھوڑ کر یہاں آ گئے اور اس طرح ابراہیم کے پاس ۷ ہزار کی فوج ہو گئی تھی۔

پانگل کے بعد ابراہیم قطب شاہ کا دوسرا مقام گولکنڈہ تھا۔ جہاں یہ قطب شاہی کاروان صد ہا امید و بیم کے ساتھ نازل ہوا۔ اگرچہ اس وقت گولکنڈہ کی حیثیت ایک معمولی موضع سے زیادہ نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو ابراہیم قطب شاہ کی سیاسی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی زمانہ میں گولکنڈہ کا قلعہ فوجی مستقر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور یہاں سے سلطنت کے جنوبی حصوں پر گرفت رکھی جاتی تھی تاکہ سلطنت وجیانگر

---

[5] فرشتہ حصہ چہارم ۱۷۰

کی ہر پیشقدمی کا بروقت سد باب ہو سکے ۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس وقت یہ گولکنڈہ اپنے تمام اعضائے سیاسی کے ساتھ ابراہیم کی مدد کے لئے تیار ہو گیا اور سچ تو یہ ہے کہ ابراہیم کی تمام کامیابی کچھ اسی تائید کی وجہ سے تھی ۔ ورنہ اس کی پیشقدمی گولکنڈہ تک کچھ آسان نہ تھی ۔ اس قلعہ کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کی آمد سے یہاں ایک سنسنی دوڑ گئی اور اس کی امداد کے لئے ایک زبردست اتحاد ہو گیا تمام سپاہی اور نائکواڑی جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے اس سیاسی خدمت کے لئے تیار ہو گئے اور یہ اپنا فرض سمجھنے لگے کہ ابراہیم کو تخت گولکنڈہ پر بٹھانا چاہئے یہ ایسا خوشگوار ماحول تھا کہ اس قطب شاہی جماعت کو یہاں آنے کے بعد محسوس ہوا کہ ان کی منزل مقصود یہی ہے ۔ کیونکہ یہ ایسی اچھی پناہ گاہ تھی کہ اگر ابراہیم کو اپنی پیشقدمی میں گولکنڈہ کی دیواروں کے پاس شکست بھی ہو جاتی تو وہ یہاں واپس آ کر دم لے سکتا اور پھر قسمت آزمائی کر سکتا تھا ۔ اس لئے تاریخ قطب شاہی کا بیان یہ ہے کہ ابراہیم یہاں بہت دنوں تک ٹھہرا رہا اور ممکنہ طاقت فراہم کی ۔ غالباً یہاں اس کی مدت قیام دو مہینے ہے ۔ اس دوران میں اس کو باہر سے بھی بہت کچھ مواد فراہم ہوتا رہا ۔ چنانچہ تاریخ قطب شاہی کے الفاظ میں ۔ چار ہزار جنگجو سوار جو امرا اور خوانین پر مشتمل تھے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے ۔ ان میں اکثر گولکنڈہ کے اکابر تھے جو ابراہیم کی امداد کے لئے یہاں بھاگ آئے تھے[۱]۔

مرکزی حکومت میں ہلچل ابراہیم قطب شاہ کی روز افزوں طاقت مرکزی حکومت کو بہت خوف دلا رہی تھی اور اس کا اثر اس قدر

---

[۱] تاریخ قطب شاہی ۱۳۵

چھار ہا تھا کہ ہر طبقہ اپنے مستقبل کی سوچ رہا تھا۔ جو لوگ اس وقت سبحان قلی اور عین الملک کے بہی خواہ تھے ان میں اس وقت نئے تاجدار کا شوق دید چرا رہا تھا۔ اس لئے عین الملک کے لئے مدافعت کا سامان کرنا ضروری تھا۔ دار السلطنت کی حفاظت کے لئے بحر یخان جگبیت راؤ۔ حاجی خان سر نوبت اور اخلاص خاں حبشی متعین کئے گئے اور عین الملک کے ساتھ پیشقدمی کی غرض سے خداوند خاں حبشی۔ علم خاں۔ سنجر خاں مقبول خاں اور تاج خاں رکھے گئے تھے اور اس طریقہ سے یہ مدافعتی فوج گھن پورہ پہنچ گئی لیکن عین الملک کے کوچ کرتے ہی یہ معلوم ہوا کہ خود گولکنڈہ میں سازش ہو گئی۔ اکثر نا ئکواڑی ابراہیم کی امداد کے لئے تیار ہو گئے۔ یہاں ان کے راستہ میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ ان لوگوں نے ابراہیم کی خدمت میں ایک متفقہ درخواست اس مضمون کی روانہ کی کہ اگر آپ جگدیو راؤ کو قید سے رہا کرتے ہیں تو ہم آپ کی مدد کرنے کے لئے آمادہ ہیں اور آیندہ اُمید میں جگدیو راؤ کو قید سے رہا کر دیا۔ اور ابراہیم کے مخالفوں کو جو راستے میں مزاحم ہونے والے تھے۔ راستہ سے ہٹانے کی کوشش کی۔ جو لوگ سبحان قلی اور عین الملک کے ہمدرد تھے ان میں سے اکثر قتل کر دیے گئے۔ چنانچہ بحر یخاں۔ اخلاص خاں اور حاجی خاں کے سر نیزوں پر چڑھا کر شہر میں گھمائے گئے۔ خود سبحان قلی کو قید کر دیا گیا اور خزانہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس ضروری انتظام کے بعد ان لوگوں نے ابراہیم کو گولکنڈہ آنے کی دعوت دی۔ اس طریقہ سے ابراہیم کیلئے گولکنڈہ تک تمام راستے صاف ہو گئے۔ اب عین الملک کے لئے کامیابی کی کوئی صورت نہ تھی کیونکہ اس کو دو زبردست طاقتوں کا مقابلہ کرنا تھا جو اس کے لئے بہت کٹھن تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان حالات سے مجبور ہو کر اس نے ابراہیم سے معافی مانگنے کی کوشش کی۔ تذکرہ الملوک کا بیان ہے کہ

عین الملک نے گولکنڈہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ لیکن جب گولکنڈہ کی سازش کی اطلاع ملی تو پانچ ہزار قطب شاہی سواروں کے ساتھ گولاس کے راستے سے ملک کے باہر بھاگ گیا۔[1] ممکن ہو کہ یہ صحیح ہو۔ لیکن تاریخ قطب شاہی کا بیان یہ ہے کہ اس نے کھن پورہ سے ابراہیم کی خدمت میں درخواست کی تھی کہ بندہ کو آستاں بوسی کی اجازت دی جائے[2] لیکن ابراہیم سمجھتا تھا کہ عین الملک اس کا کبھی دوست نہیں ہو سکتا تھا۔ تاریخ کے الفاظ ہیں "استدعائے عین الملک از صمیم قلب نہ بود"[3] چنانچہ ابراہیم نے اس کو آنے کی اجازت نہیں دی بلکہ اس کو لکھا کہ میں خود آرہا ہوں وہاں ملاقات ہو جائے گی۔ اس سے عین الملک بہت گھبرایا اور بھاگنے کے سوا اس کے پاس کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ابراہیم قطب شاہ اس سے ضرور انتقام لے گا۔ پانچ ہزار سوار اور چند سرداروں کے ساتھ جو اس کے ساتھ تھے گولاس کے راستے سے سلطنت گولکنڈہ کی سرحد سے باہر چلا گیا۔ اغلب یہ ہے کہ سلطنت برار میں سکونت پذیر ہوا ہو۔ اگرچہ عین الملک کے جانے سے نقصان ضرور تھا کہ اس کے اغوا سے گولکنڈہ کے بعض دیرینہ آدمی اس کے ساتھ چلے گئے اور بہت سا قطب شاہی سامان اس کے ساتھ غائب ہو گیا۔ لیکن اس کے فرار سے ابراہیم کی رہی سہی مشکلات کا خاتمہ ہو گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کے راستے میں عین الملک کی تنہا مزاحمت باقی رہ گئی تھی جو گولکنڈہ کے راستے میں کسی جگہ کچھ نہ کچھ خونریزی کی باعث ہوتی۔ لیکن اب مطلع بالکل صاف تھا، جگدیو راؤ کی ایک

---

[1] تذکرہ الملوک خافی ۱۳۹۔

[2] تاریخ قطب شاہی ۱۳۷۔

[3] تاریخ قطبیہ ۷۶۔

آدھ بغاوت جو ابراہیم کے تخت نشین ہونے بعد ہوئی وہ آسانی سے فرو ہوگئی۔ جب امین خان دبیر نے گولکنڈہ آکر عین الملک کے فرار اور گولکنڈہ کے تمام حالات بیان کئے تو ابراہیم نے کوچ شروع کر دیا۔[1]

ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی قطب شاہی خاندان کے حقیقی وارث تخت کا سات سال کی جلا وطنی کے بعد گولکنڈہ کی دیواروں کے سامنے آنا تاریخ دکن کا ایک مسرت خیز واقعہ تھا جس کی مسرت کا اندازہ آج چار سو سال بعد نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ دکن میں اس قسم کی غیر معمولی مسرت پھر اس وقت ہوئی تھی جبکہ چاند بی بی مغلوں کی مدافعت کے لئے بیجاپور سے اپنے وطن مالوف احمد نگر کو بچانے کے لئے آئی تھی۔ اس نوجوان بادشاہ کی آمد سے جو اپنے تمام شاہی اوصاف کے ساتھ سلطان قلی قطب شاہ کا صحیح جانشین تھا تلنگانہ کے جسد مردہ میں جان آگئی تھی۔ تمام اہل گولکنڈہ اس وقت سے چشم براہ تھے جبکہ پانگل میں اس کا نزول اجلال ہوا تھا۔ ان چند مخالفوں کو چھوڑ کر جو یا تو قید تھے یا شہر بدر ہو چکے تھے گولکنڈہ کا بچہ بچہ انتہائی شادمانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مسرت کی جو لہریں کئی مہینوں سے پانگل کی سرحد سے تمام تلنگانہ کے طول و عرض میں منتشر ہو رہی تھیں۔ آج ایک مرکز پر جمع ہو گئی تھیں۔ شاعر قصیدہ ہائے مبارکباد لکھ رہے تھے۔ گویے مسرت کے گیت گا رہے تھے۔ تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے کہ جب ابراہیم قطب شاہ کا جلوس گولکنڈہ کے قریب پہنچا تو۔ عام لوگوں کے علاوہ تمام اکابر سلطنت استقبال کے لئے قلعہ کے باہر موجود تھے۔ جگدیو راؤ اور دوسرے نائکواڑیوں نے قلعہ کی تمام کنجیاں ابراہیم قطب شاہ کے سامنے رکھ دیں اور قلعہ میں تشریف لانے کی درخواست کی۔ چنانچہ ۱۲ رجب ۹۵۷ھ کو دوشنبہ کے دن رسم تخت نشینی ادا کی گئی جو گولکنڈہ کی تاریخ کا بہت ہی مبارک دن تھا۔ یہ صرف

---

[1] تاریخ قطبیہ ۷۷

اس وجہ سے مبارک دن تھا کہ آج سات سال کا تاریک دور ختم ہو رہا تھا اور خانہ جنگیوں کا خاتمہ ہو رہا تھا بلکہ یہ وہ تاریخ تھی جو سلطنت گولکنڈہ کو آئندہ غیر معمولی ترقیوں کا پیغام دے رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ سلطنت گولکنڈہ کی اصل تعمیر ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے شروع ہوئی جو محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں جاکر مکمل ہوئی۔ اگر ابراہیم قطب شاہ کو تخت سلطنت نصیب نہ ہوتا تو نہ صرف اس سلطنت کو یہ عظمت نصیب نہ ہوتی بلکہ حالات ظاہر کرتے ہیں کہ اس کا بہت جلد خاتمہ ہو جاتا۔ رسم تخت نشینی کے بعد ان لوگوں کو جنھوں نے وفاداری کا ثبوت دیا تھا مناصب جلیلہ سے سرفراز کیا گیا اور ۱۲ ہزار ہون غربا اور مستحقین میں تقسیم کیے گئے۔

عبدالمجید صدیقی

عبداللہ قطب شاہ کی لڑکیوں کی شادیاں

مسئلہ وراثت کی پیچیدگی | عبداللہ قطب شاہ کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ سنہ ۱۰۴۱ھ[1] میں ایک لڑکا پیدا ہوا، لیکن قدرت کی طرف سے صرف چند روزہ زندگی اُس کو عطا کی گئی تھی، یعنی سات مہینے اور بیس دن کی قلیل مدت کے بعد اُس کا انتقال ہوگیا۔ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جبکہ بادشاہ ابھی جوان تھا۔ یہ توقع ایک حد تک بجا تھی کہ کوئی اور وارث تخت و تاج اس مرحوم شہزادہ کی جگہ لینے کے لئے کارکنانِ قضا و قدر کی طرف سے نامزد کر دیا جائے گا۔ لیکن مرورِ ایام نے اس اُمید کو مایوسی سے بدل دیا اور جو کچھ توقع تھی وہ جاتی رہی۔ خاندان قطب شاہی بے چشم و چراغ ہوتا نظر آتا تھا۔ جوں جوں بادشاہ کا پیمانۂ حیات لبریز ہوتا گیا، کسی لڑکے کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے مسئلہ وراثت کی پیچیدگیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ عبداللہ کی اولاد میں اس وقت صرف تین لڑکیاں تھیں۔ ظاہر اس کے سوا کوئی اور صورت نہ تھی کہ ان کی شادیوں کے بعد کسی ایک داماد کو جو ہر حیثیت سے منصب شاہی کے لائق اور موزوں ہو، بادشاہ اپنا جانشین مقرر کردے اس لحاظ سے عبداللہ قطب شاہ کے آخری دور میں، ان لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ اصل میں سلطنت گولکنڈہ کے اہم ترین سیاسی مسائل میں سے ہوگیا تھا۔ اسی سیاسی اور تاریخی اہمیت کے مدنظر اس مسئلہ پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے گی۔

---

[1] مُلّا وجہی نے اس لڑکے کی پیدائش کے موقع پر ایک دلچسپ تاریخ کہی تھی۔ "آفتاب از آفتاب آمد پدید" (۱۰۴۱ھ) ملاحظہ ہو حدیقۃ السلاطین مصنفہ نظام الدین، قلمی نسخہ، کتب خانہ ملکی دہلی۔

پہلی لڑکی کی شادی اور تاریخی اختلافات

عبداللہ قطب شاہ کی سب سے بڑی لڑکی سید نظام الدین احمد سے بیاہی گئی۔ اس کو بعض مورخوں نے سید احمد[1] کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ یہ شخص ایران کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتا تھا، لیکن اس کی پیدائش مکہ معظمہ کی ہے۔ اور وہیں اس کی پرورش و پرداخت ہوئی[2]۔ اس کے والدین شیراز سے یہاں آکر بس گئے تھے۔ نظام الدین کا باپ میر معصوم اپنے زمانے کا ایک نہایت ہی قابل اور فاضل شخص سمجھا جاتا تھا۔ شیراز کا مشہور مدرسہ "منصوریہ" میر معصوم کے باپ میر غیاث الدین کا قائم کردہ تھا۔ اس طرح یہ خاندان علم و فضل کے لئے شیراز میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب شاہ عباس ثانی صفوی کی بہن نے زیارت حرمین شریفین کا ارادہ کیا تو بادشاہ نے میر معصوم کو اس لئے بیگم کے ہمراہ کر دیا کہ "بہ تعلیم مناسک حج بپردازد"۔ راستہ میں نہ معلوم کیا صورتیں پیدا ہوئیں کہ ان دونوں نے عربستان پہونچ کر عقد کر لیا چونکہ یہ عقد شاہ ایران کی مرضی کے بغیر ہوا تھا، ان دونوں نے ایران کو واپس جانا مناسب نہیں سمجھا اور مکہ معظمہ میں رہ پڑے۔ یہاں ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سید نظام الدین احمد رکھا گیا۔ یہی بعد میں چل کر عبداللہ قطب شاہ کا داماد ہوا۔ یہ تمام تر بیان علامہ آزاد بلگرامی کا ہے اور یہاں تک کوئی بات قابل اعتراض بھی نہیں، اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

"میر محمد سعید میر جملہ اردستانی وزیر عبداللہ قطب شاہ والی حیدرآباد مبالغ زرداں

---

[1] خافی خاں وغیرہ اس کا نام، سید احمد بتاتے ہیں، لیکن علامہ آزاد بلگرامی نے اس کے خاندان کی تحقیق کے ساتھ، اس کا نام سید نظام الدین احمد بتایا ہے ملاحظہ ہو سرو آزاد، ص ۲۸۶

[2] اسی لئے غالباً ٹیورنیر کو یہ دھوکا ہوا کہ وہ شیخ الشیوخ مکہ کا رشتہ دار ہے۔ سفرنامہ ٹیورنیر۔

فرستادہ میر نظام الدین احمد را و سید سلطان را کہ از سادات نجف اشرف بود، بہ حیدر آباد طلبید، کہ دو دختر سے کہ داشت آنہارا بسلک ازدواج ہر دو سید کشد۔ اتفاقاً سلطان عبد اللہ

را ہم دو دختر بودند سلطان خواست کہ دختران خود را بہ ہر دو سید تزویج کند۔ میر جملہ

برآشفت و برخاستہ بدرگاہ خلد مکان عالمگیر شتافت[1]" اس کے بعد سلطان نے پہلی لڑکی کی شادی نظام الدین سے کردی اور دوسری کی شادی کی تیاریاں کرنے لگا۔ علامہ آزاد کے بیان پر اگر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو اُس کی کمزوریاں صاف طور پر عیاں ہونے لگیں گی اگر اس امر کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نظام الدین احمد اور سید سلطان میر جملہ کے طلب کرنے پر یہاں آئے تھے تو یہ بات کس قدر بھونڈی معلوم ہوتی ہے کہ ایک بادشاہ نے اپنے ایک ادنیٰ ملازم کے ہونے والے دامادوں کو چھین کر اپنی دامادی کا شرف بخشا چاہا ہو، جو اُس کی شان کے ہرگز شایاں نہ تھا، دوسرے علامہ آزاد لکھتے ہیں کہ بادشاہ کی اس حرکت سے ناراض ہو کر میر جملہ نے اپنا تعلق مغلیہ حکومت سے پیدا کر لیا حالانکہ میر جملہ کی بغاوت[2] اور غداری کے اسباب تمام تر سیاسی تھے۔ تیسرے علامہ آزاد کا بیان ہے کہ اتفاق سے بادشاہ کے بھی دو لڑکیاں تھیں۔ تاریخ کا ہر معمولی طالب علم جانتا ہے کہ عبد اللہ قطب شاہ کے دو نہیں بلکہ تین لڑکیاں تھیں۔ ان امور کے پیش نظر علامہ آزاد بلگرامی کا بیان کوئی تاریخی وقعت رکھتا نظر نہیں آتا۔[3]

ٹیورنیر کا بیان | علامہ آزاد کے بعد ٹیورنیر کے بیان پر ایک سرسری نظر ڈال لینی ضروری ہے

---

[1] سرو آزاد صفحہ ۲۵۶

[2] اس پر دوسری لڑکی کی شادی کے سلسلہ میں مفصل بحث کی گئی ہے۔

[3] سلسلہ آصفیہ کے مصنف اور جادو ناتھ سرکار دونوں نے علامہ آزاد کے بیان کی ہمنوائی کی ہے۔

اُس کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ کی سب سے بڑی لڑکی ایک عرب کو دی گئی ہے جو شیخ الشیوخ مکہ کا رشتہ دار ہے۔ یہ شخص شائقوں کے بھیس میں گولکنڈہ آیا۔ اور شاہی حرم سرا کے دروازے پر اپنا تکیہ لگایا۔ بادشاہ کے حضور میں پیش کئے جانے پر اُس نے یہ خواہش کی کہ شہزادی سے اُس کی شادی کر دی جائے اس گستاخی پر اُس کو قید کر دیا گیا دو سال اُس نے یونہی گذارے۔ بعد میں بادشاہ کے حکم سے اُس کو اُس کے اپنے وطن روانہ کر دیا گیا۔ لیکن یہ شخص کچھ عرصہ بعد پھر گولکنڈہ میں آ موجود ہوا۔ اور اس مرتبہ اس نے کچھ ایسی تدابیر اختیار کیں کہ بادشاہ کی بڑی لڑکی اُس سے منسوب ہو گئی، یہ ٹیورنیر کا بیان ہے۔ لیکن ہر سمجھ دار آدمی جو ایک نظر بھی اس بیان پر ڈالے اس کو ایک دلچسپ گپ سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتا۔ اور ایک ایسے مضحکہ خیز بیان پر کسی قسم کی تنقید کرنا اس کی وقعت میں اضافہ کرنا ہے۔ شیخ کا حرم سرا کے دروازے پر آ بیٹھنا کسی کے سوال کا جواب نہ دینا شہزادی سے یکایک شادی کی خواہش کرنا، شادی کے نہ ہونے کی صورت میں ملک پر آفت کے نازل ہونے کی پیش گوئی کرنا، اور پھر دوسرے چکر میں کچھ ایسی تدابیر اختیار کرنا جو پہلے اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں، یہ تمام باتیں ایک دلچسپ اور فرضی افسانے کا لازمی جز ہیں[1]۔ اس کے گھڑنے میں ٹیورنیر کو جو دماغی کاوشوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، یقیناً وہ اُس کے لئے داد کا مستحق ہے۔

ان متضاد اور دلچسپ بیانوں کو پیش نظر رکھ کر حالات پر غور کرنے کے بعد جو صحیح نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ سید نظام الدین احمد نے عرب کی علم پرور فضا میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کا رُخ کیا۔ اس زمانے میں

---

[1] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو سفر نامۂ ٹیورنیر۔

ہندوستان کی علمی سرپرستیوں کا شہرہ تمام بلادِ اسلامی میں پھیلا ہوا تھا۔ اور مختلف مقامات کے بہترین دل و دماغ یہاں کی علماء و فضلاء پروری کا حال سُن کر کھنچے ہوئے اس طرف چلے آتے تھے۔ یہ ایک ایسی عام حقیقت ہے کہ اس کے لئے کسی مثال کا پیش کرنا، بیان کو غیر ضروری طوالت دینا ہے۔ نظام الدین احمد نے بھی تلاش روزگار میں ہندوستان کا رُخ کیا۔ اور گولکنڈہ کی شیعہ پرستی کا حال سُن کر، دارالسلطنت حیدرآباد پہونچ گیا۔ چونکہ آدمی قابل اور سمجھدار تھا، بہت جلد اُس نے ترقی کر لی۔ بادشاہ کے مزاج میں اس کو دخل ہو گیا، اور شاہی خاندان سے بھی اُس کا رشتہ پیدا ہو گیا یعنی عبداللہ قطب شاہ نے اپنی بڑی لڑکی سے اُس کی شادی کر دی۔ خافی خان نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے "عبداللہ قطب شاہ دو دختر کلاں خود را کہ بہ بڑی بماجنی زبان زد بود بہ میرزا احمد کہ از سادات صحیح النسب عربستان گفتہ می شد منسوب ساختہ اختیار کاروبار سلطنت بہ قبضۂ اختیار او در آوردہ بود۔" (خافی خان جلد سوم ص ۴۰۵)[1]

عبداللہ قطب شاہ کی دوسری لڑکی کی شادی

عبداللہ قطب شاہ کی دوسری لڑکی کی شادی جن حالات میں عمل میں آئی اُس کی تفصیل لکھنا گویا اس دور کے ایک اہم سیاسی واقعہ کو پیش کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں اس سیاسی کنجلک کو منظر عام پر لانا پڑے گا جو میر جملہ کی علیحدگی اور اورنگ زیب کے حملے کی وجہ سے گولکنڈہ میں رونما ہوئی جس کے نتیجہ کے طور پر بادشاہ کو اس امر پر مجبور ہونا پڑا کہ اپنی دوسری لڑکی کو مغل شہزادہ محمد سلطان سے بیاہ دے۔ یوں تو یہ حملہ اُن کشیدگیوں اور غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے، جو عرصہ دراز

---

[1] حدیقۃ العالم اور تاریخ قطب شاہی (مصنفہ قادر خاں بیدری) کے بیانات ایک دوسرے کی نقل ہیں اور ان دونوں نے خافی خان اور علامہ آزاد بلگرامی کے بیانات یکے بعد دیگرے درج کر دیئے ہیں

سے قطب شاہی اور مغل حکومت کے درمیان پیدا ہو رہی تھیں، مگر یہاں اس امر کا موقع نہیں کہ ان سب پچھلے واقعات، تعلقات اور اختلافات کا اعادہ کیا جائے۔ ہم کو صرف اس حملے کے فوری اسباب کی طرف توجہ کرنی پڑے گی اور ان فوری اسباب میں سب سے بڑا اور اہم سبب میر جملہ کی غداری ہے۔

میر جملہ محمد سعید | میر محمد سعید میر جملہ اصل میں صفاہان کا باشندہ تھا۔ تجارت کے سلسلہ میں وہ گولکنڈہ آیا۔ تاجر کی حیثیت سے دربار میں رسوخ حاصل کرتے کرتے، ملک کی معزز اور ممتاز خدمتوں پر مامور ہونے لگا۔ ایک عرصہ تک سر خیلی کی اہم خدمت اس کے سپرد رہی حدیقۃ السلاطین[1] کے اوراق اس شخص کی قابلیت، کاردانی اور تدبر کے بیان سے بھرے پڑے ہیں۔ بادشاہ کو بھی اس پر بڑا اعتماد تھا۔ دربار میں اس نے اتنا رسوخ حاصل کیا کہ شاید ہی کسی امیر کو نصیب ہو۔ تدبر کے ساتھ ساتھ چونکہ فوجی قابلیتیں بھی اس میں موجود تھیں اسی لیے بادشاہ نے اس کو علاقہ جات کرناٹک کی فتح کے لئے مامور کر دیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۰۵۲ھ کا ہے۔ ایک ہی سال کے اندر اندر اس نے شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ ان فتوحات کے سلسلہ میں درباری مورخ نظام الدین نے یہ الفاظ لکھے ہیں "تا آخر ماہ ذالحجہ سنہ مذکور (جلوس ہفدہم) دو از ۱۲ دہ کردہ مسافت از مملکت کفار با چند قلعہ بحیطہ تسخیر غازیان و مجاہدان نصرت شعار در آمدہ"[2]

یہ تو محض چند مہینوں کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک چونکہ اس کا یہاں قیام رہا، ان فتوحات نے اس کی قوت اور اقتدار میں غیر معمولی اضافہ کر دیا۔ یہ اقتدار چاہے میر جملہ کے لئے کتنا ہی فائدہ رساں اور باعث تقویت کیوں نہ ہو لیکن

[1,2] حدیقۃ السلاطین مصنفہ نظام الدین قلمی نسخہ کتب خانۂ عالی دکن۔

مرکزی حکومت کو اپنے ایک ماتحت سپہ سالار کی اس غیر معمولی[1] قوت سے اندیشہ اور خطرہ کا پیدا ہونا اک بالکل فطری امر تھا۔ عبداللہ قطب شاہ نے غالباً اسی خطرہ کو محسوس کیا اور کچھ ایسی تدابیر اختیار کرنے کی کوشش کی جو جائز حد تک میر جملہ کی قوت کو محدود کرنے میں مدد دے سکتی تھیں۔ یہ چیز میر جملہ کے منشار کے خلاف پڑتی تھی۔ لہذا ایک کشمکش پیدا ہوئی۔ اور درباری سازشیوں نے اس پر اپنا رنگ چڑھانا شروع کیا۔ دربار میں اس وقت محمد امین اپنے باپ میر جملہ کی نیابت کرتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح اس کو ان اندرونی کارروائیوں کا حال معلوم ہو گیا۔ اس نے اپنے باپ کو اطلاع کر دی۔ اور ادھر خود اس نے بجائے کسی مدبرانہ پالیسی کے اختیار کرنے کے احمقانہ روش اختیار کر لی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ بادشاہ سے گستاخی کے ساتھ پیش آیا[2]۔ ان احمقانہ حرکات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ محمد امین اور اس کے خاندان کی گرفتاری کے احکام صادر کر دیے گئے۔ اور وہ قلعہ گولکنڈہ میں محبوس کر دیا گیا۔

میر جملہ کے معاملے میں مغلوں کی مداخلت

اس عرصہ میں میر جملہ اپنے بچاؤ کی کوشش میں مصروف تھا۔ پہلے اس نے شجاع سے مدد کی درخواست کی جو رد کر دی گئی۔ اورنگ زیب اس وقت صوبہ داری دکن کی خدمات انجام دے رہا تھا۔ میر جملہ نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا

---

[1] وارث تصنیف شاہ جہاں نامہ نے لکھا ہے کہ چالیس لاکھ کی سالانہ آمدنی اس کو تھی۔ منوچی کا بیان ہے اس کی فوج میں کئی یورپین ملازم تھے جس کی وجہ سے اس کی حربی قوت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی سلسلہ میں منوچی اور برنیر کا مضحکہ خیز بیان یہ ہے کہ میر جملہ کے ناجائز تعلقات، بادشاہ کی ماں اور اس کی بیوی سے تھے۔ ملاحظہ ہو "استوریا" جلد اول ص۲۲۳ اور سفرنامہ برنیر۔

[2] مآثر الامراء کے مصنف نے لکھا ہے کہ محمد امین بادشاہ کی مسند پر سو گیا اور پھر قے کر دی۔ ٹیورنیر نے لکھا ہے کہ سخت گستاخانہ گفتگو کی۔

اور یہاں اُس کو کامیابی ہوئی شہزادہ کی سفارش پر شاہ جہاں نے میر جملہ کی حمایت میں ایک فرمان صادر کیا جس کو ماثر الامراء کے مصنف نے یوں بیان کیا ہے۔

"فردوس آشیانی برطبق استدعائے شہزادہ منشور عنایت متضمن مرحمت پنجہزاری ذات دسوار و دو ہزاری، ہزار سوار بہ میر محمد امین پسرش و فرمان درباب عدم مخالفت، تعرض مرد، متعلقان او بہ قطب شاہ مصحوب قاضی محمد عارف کشمیری روانہ فرمود"[1]

اس طرح ایک ایسا معاملہ جو تمام تر گھریلو سیاسیات سے متعلق تھا تعلقات خارجہ کے پیچیدار داستان میں اُلجھ گیا۔ مغلیہ حکومت واقعی موقع کی تلاشی تھی۔ میر جملہ کی درخواست نے اُسے یہ موقع بہم پہنچا دیا۔ مغلیہ حکومت کو قطب شاہی حکومت سے چاہے دیگر معاملات میں کچھ بھی شکایات کیوں نہ ہوں، لیکن اس معاملہ کی حد تک اُس کی اس حرکت کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ہر سلطنت کے ایک باغی اور طاقتور امیر کو ایک دوسری ہمسایہ اور زبردست سلطنت اپنی حمایت میں لے لے، اور اُس کے بچاؤ کی خاطر اس سلطنت پر حملہ کر دے تو یہ بالکل صاف اور ظاہر بات ہے کہ ایسی سلطنت کبھی اپنا نظم و نسق اور حکومتی وقار قائم نہیں رکھ سکتی۔ مغلیہ تاریخیں اس معاملہ میں جو کچھ لکھتی ہیں وہ دراصل مغلیہ حکومت کا نقطۂ نظر پیش کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے قطب شاہی حکومت کا اس معاملہ میں جو کچھ زاویۂ نگاہ ہو سکتا تھا وہ پس پشت ڈال دیا گیا اور اُس کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی اور محض مغلوں کی حمایت کی وجہ سے کسی کو اس امر کی جرأت نہ ہوئی کہ میر جملہ کو اس کے صحیح نام سے پکارے یعنی غدار اور نمک حرام کے الفاظ اس کے نام کے ساتھ شریک کیے جائیں۔

---

[1] جلد سوم صفحہ ۵۳۲

مغلوں کا حملہ ریاست حیدرآباد پر۔ میر جملہ کے معاملہ میں مغلوں کی اس غیر متوقع مداخلت نے عبداللہ قطب شاہ کو پریشان کر دیا۔ نہ یہ ممکن تھا کہ کسی طرح مغلوں کو اس غیر ضروری مداخلت سے باز رکھا جائے، اور نہ اس امر کا امکان تھا کہ اپنا شاہانہ وقار قائم رکھتے ہوئے میر جملہ اور اُس کے بیٹے کی غدرانہ کارروائیوں سے یوں سرسری طور پر درگذر کیا جائے۔ ابھی وہ اسی پس وپیش میں تھا کہ مغلیہ فوجیں شاہ جہاں کے حکم سے حیدرآباد کے قریب پہونچ گئیں[1]۔ ۸ ربیع الاول ۱۰۶۶ھ کو اورنگ زیب نے اپنے بڑے بیٹے محمد سلطان کی سرکردگی میں ایک فوج حیدرآباد روانہ کر دی، اور خود ۳ ربیع الاول کو ایک فوج گراں کے ساتھ روانہ ہوا، شہزادہ سلطان نانڈیر سے ہوتا ہوا، حیدرآباد کے حدود تک پہنچ گیا عبداللہ قطب شاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ مغلیہ فوجیں بڑھی چلی آرہی ہیں تو اس کو سراسیمگی کی حالت میں اس کے سوائے کچھ اور نہ سوجھا کہ محمد امین کو رہا کر کے شہزادے کے پاس بھیجدیا جائے، چنانچہ محمد امین مع اپنے خاندان کے رہا کر دیا گیا۔ ابھی محمد سلطان حیدرآباد سے بارہ کوس کے فاصلہ پر ہی تھا کہ محمد امین اپنے متعلقین سمیت اُس کی خدمت میں حاضر ہو گیا

---

[1] اورنگ زیب کو جو فوجی کارروائی کا حکم ملا اس کی تفصیل شاہ جہاں نامۂ محمد وارث میں موجود ہے (ملاحظہ ہو قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ) اس کا ایک جملہ یہاں نقل کیا جاتا ہے "اما احتیاطاً بر طبق ملتمس آں فرزند حکم می شود کہ روانہ آں صوب گردد" اور اس کے ساتھ شایستہ خاں اور دیگر اُمرا کو اورنگ زیب سے ملحق ہونے کا حکم ملا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حملہ کی ذمہ داری اورنگ زیب پر نہیں بلکہ مرکزی حکومت پر تھی۔ خافی خاں اور اُس کی اتباع میں مآثر الامرا کے مصنف نے یہ روایت بیان کی ہے کہ اورنگ زیب نے عبداللہ کو دھوکہ میں رکھنے کے خیال سے یہ بات مشہور کر دی کہ محمد سلطان شادی کی غرض سے بنگالہ براہ حیدرآباد جا رہا ہے۔ حالات پر نظر کرتے یہ روایت از سرتاپا غلط نظر آتی ہے مگر پھر بھی انگریزی مورخین نے اس کو صحیح

عبداللہ نے محمد امین کو رہا تو کردیا لیکن ایک بڑی غلطی یہ کی کہ اُس کا ضبط شدہ مال و اسباب اُس کے ساتھ روانہ نہیں کیا۔ مغلوں کو اپنی جارحانہ کارروائی جاری رکھنے کے لئے یہ بہانہ بھی کافی تھا۔ چنانچہ محمد سلطان اس عذر کے ساتھ کہ عبداللہ نے ضبط شدہ مال اسباب روانہ نہیں کیا ہے حیدرآباد کی جانب بڑھتا ہی گیا۔

مغل فوجوں کے بالکل قریب پہونچ جانے کی اطلاع پر عبداللہ نے ایک نہایت ہی احمقانہ اور بزدلانہ حرکت یہ کی کہ شہر حیدرآباد کو بے محافظ چھوڑ کر گولکنڈہ فرار ہو گیا تاکہ اس مضبوط قلعہ میں محصور ہو جائے۔ عین حملہ کے موقعہ پر اِس غیر سپاہیانہ حرکت سے شہر کو جو کچھ نقصان پہونچ سکتا تھا اُس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ مغلیہ فوجیں اس وقت حسین ساگر پہونچ گئی تھیں اور اسی مقام پر قطب شاہیوں کی ایک چھوٹی سی فوج سے جو پانچ چھ ہزار سوار، اور بارہ ہزار پیادہ تفنگچی پر مشتمل تھی مقابلہ ہوا۔ اس فوج کی سرداری یولچی بیگ، مظفر لودی، اور میر ابراہیم کو عطا کی گئی تھی۔ مقابلہ میں قطب شاہیوں نے کچھ بہادری کا ثبوت نہ دیا معمولی کشت و خون کے بعد انھوں نے راہ فرار اختیار کی۔ شہزادہ محمد سلطان اُن کا تعاقب کرتا ہوا خاص شہر حیدرآباد میں داخل ہو گیا اور حتی الامکان اس امر کی کوشش کی کہ رعایا اور عام باشندوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہونچنے پائے۔ بڑی حد تک وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہوا۔ چنانچہ اورنگ زیب نے اپنے ایک خط میں محمد سلطان کے اس انتظام کی یوں تعریف کی ہے: "فرزند سعادت مند از تالاب حسین ساغر کوچ نمودہ بہ شہر درآمدہ در محافظت سکنۂ آں بلدہ از نہب غارت آں عساکر قاہرہ مساعی جمیلہ بظہور آوردہ، آں چناں شہر وسیع معمور را بہ واقعی ضبط نمود"۔ (آداب عالمگیری قلمی نسخہ آصفیہ) اورنگ زیب نے اُس

سلہ شاہ جہاں نامہ دا. شقہ

کے انتظام کی تعریف تو کی ہے مگر پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد، باوجود محمد سلطان کی کوششوں کے تاخت و تاراج سے محفوظ نہ رہ سکا۔[1]

گولکنڈہ کا محاصرہ[2] اورنگ زیب چونکہ محمد سلطان کے روانہ ہونے کے کچھ مدت بعد اپنے مستقر سے نکلا تھا، اسی لئے ان واقعات کے بعد حیدرآباد پہونچا۔ اور اسی اثنار میں شایستہ خاں اور دیگر امراجن کو دکن پر حملہ کا حکم ہوا تھا، حیدرآباد آپہونچے۔ اب ان لوگوں نے اورنگ زیب کی سرکردگی میں متحدہ طور پر اس امر کی کوشش کی کہ اس فوجی کارروائی کو کامیاب بنایا جائے۔ چنانچہ گولکنڈہ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ ادھر عبداللہ قطب شاہ نے ایک عجیب و غریب طرز عمل اختیار کر رکھا تھا۔ ایک طرف وہ حملہ آوروں کو تحفہ و تحالیف کے ذریعہ سے رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسری طرف اندرونی طور پر جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس کو غالباً یہ توقع تھی کہ ایسے موقع پر عادل شاہی حکومت سے کچھ امداد پہونچ جائے گی۔ مگر یا تو عادل شاہیوں نے اس طرف کچھ توجہ نہ کی یا وہ مغلوں کی طاقت سے مرعوب ہو کر اس امر پر مجبور تھے کہ غیر جانب دار رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی مدد بیجاپور سے گولکنڈہ نہ پہونچ سکی۔ اس عرصہ میں مغلوں اور قطب شاہیوں میں کئی معرکے

---

[1] ماثر الامرا جلد سوم [2] اس حملے اور محاصرہ کی روایت جو منوچی اور برنیر نے بیان کی ہے وہ بالکل مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں میر جملہ کے کہنے پر اورنگ زیب خفیہ طور پر یہ مشہور کر کے کہ ایک شاہ جہانی سفیر آرہا ہے۔ حیدرآباد پہنچ گیا۔ خیال یہ تھا کہ بادشاہ کو غفلت میں گرفتار کر لیا جائے۔ مگر بعد میں یہ تدبیر جو میر جملہ کی بتائی ہوئی تھی کامیاب نہ ہو سکی۔ بعض تفصیلات میں ان دونوں نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے۔ سفرنامہ برنیر کانسٹیبل اڈیشن۔ منوچی مترجمہ اردن جلد اول

ہوئے۔ جن میں اکثر قطب شاہیوں کو منہ کی کھانی پڑی جب ابو الحسن قطب شاہ بالکل تنگ آگیا تو اُس نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ جس طرح بنے صلح کرکے اِس آفت ناگہانی کو ملک سے دور کرے۔ یوں تو ابتدا ہی سے وہ صلح کی کوشش کر رہا تھا، مگر اُس کے غیر یقینی طرزِ عمل نے اس صلح کو ناممکن بنا دیا اور اُس کی درخواستیں محض اُس کے تلوّن اور حیلہ سازی کی بنا پر متعدد مرتبہ رد کی جا چکی تھیں[ف] مگر جب اس نے بالحاح وزاری اپنے سفیروں کے ذریعے اورنگ زیب کی خدمت میں یہ پیام بھجوایا کہ خود اس کی ماں عفوِ تقصیر کی غرض سے اُس کے حضور میں حاضر ہوگی تو اورنگ زیب نے بھی نرمی کا سلوک اختیار کیا۔ اس درخواست اور اس کے نتیجہ کو محمد وارث نے اِن الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔

صلح اور شرائط | "چوں قطب الملک فرستادن والدہ خود بجہتِ استعفائے تقصیرات مکرّر معروض داشتہ بود التماس استمالت نامہ نمود، بر طبق خواہش اُو بہ سلطان و شایستہ خاں آوزہ۔ خان مشار الیہ را امر شدہ بود کہ استمالت نامہ بفرستد۔ پس از وصول آں بہ اُمید حصول مرام والدہ خود را فرستاد۔ و میر احمد و ابو الفضل معموری شب یکشنبہ بست و دوم حسب الامر پیش رفتہ والدۂ محترمہ قطب الملک را بدائرہ شایستہ خاں آوردند۔ خان مشار الیہ با حترام تلقی نمودہ روز دیگر بوساطت خان مشار الیہ سلطان را دیدہ و چوں التماس نمودہ کہ او خواہش دارد کہ خود آمدہ مدعات و مطالب را معروض دارد بنا بر آں اُو را بحضور طلبیدند[ف]۔ جب حیات بخش بیگم اورنگ زیب کے سامنے حاضر کی گئی تو اُس نے بذریعہ عجز و انکسار و وسیلہ ندامت و ضراعت التماس عفوِ جرائم و خطاہائے قطب الملک و لعقتن کیت پیش کش بادشاہی و قبول ازدواج صبیہ او بہ سلطاں نمود"۔ اورنگ زیب نے اس کے ساتھ ایک اور شرائط لگائی کہ ایک کروڑ روپیہ

[ف] یہ سب حصے نسخہ محولہ سے لئے گئے ہیں۔

ازجواہر ثمینہ ونقد واصل سازد"، اس طرح قطب شاہیوں نے صلح حاصل تو کرلی گر جھگڑے دامنگیر شرائط کے طے ہونے سے کچھ پہلے ہی شاہ جہاں کا فرمان اورنگ زیب کے نام وصول ہو چکا تھا کہ گولکنڈہ کا محاصرہ اُٹھا لیا جائے۔ چنانچہ اس فرمان کی تعمیل کی غرض سے بھی اورنگ زیب نے اس امر کی کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے یہ معاملہ جلد از جلد فیصل ہو جائے۔ غرض وہ آفت جو میر جملہ کی غداری کی وجہ سے اس ملک پر نازل ہوئی تھی، جس کو عبداللہ قطب شاہ نے اپنی نااہلی اور بیوقوفی سے سخت تر بنالیا تھا، بالآخر ان نتائج پر پایۂ اختتام کو پہونچی۔ ان فوجی کارروائیوں اور سیاسی پریشانیوں کے اندر عبداللہ قطب شاہ کی دوسری لڑکی محمد سلطان سے بیاہی گئی نکاح کی تفصیلات کے سلسلہ میں محمد وارث کے چند جملے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

"چون انعقاد ازدواج سلطان صبح ہجبہ ہم مقرر گشتہ بود۔ بنفدہم محمد طاہر و شیخ نظام و قاضی و میر عدل خود را نزد قطب الملک فرستادہ، خلعت و تسبیح مروارید، فیل با یراق نقرہ داده و فیل اد سال داشتند۔ قطب الملک با عزاز تلقی نمود، و در حویلی کہ متصل دروازۂ قلعہ برائے اینان قرار داده بود۔ روز دیگر در ساعت نیک خطبہ نکاح خواہد شد بر نہج قواعد سنت حنفیہ شرائط عقد بوقوع آمد"

دوسری لڑکی کی محمد سلطان سے شادی ہونے کا گولکنڈہ کی ریاست پر ایک اثر یہ ہو سکتا تھا کہ وہ قبل از وقت مغلیہ سلطنت میں ضم ہو جائے۔ مگر عبداللہ قطب شاہ ابھی

سلہ منوچی علاوہ ان دو شرطوں کے جو اکثر فارسی تاریخوں میں درج ہیں اور چند شرائط کا ذکر کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ رام گیر کا علاقہ مغلوں کے حوالہ کر دیا جائے۔ دوسرے عبداللہ کے بعد محمد سلطان اس کا جانشین ہو۔ دو، سٹوریا جلد اول۔ موخر الذکر شرط کو گردھاری لال مصنف تاریخ ظفرۂ دکن نے بھی دوہرایا ہے۔

مرنے بھی نہ پایا تھا کہ محمد سلطان کا ستارۂ اقبال مائل بہ زوال ہوا۔ اور بجائے تخت و تاج حاصل کرنے کے اُس نے اپنی زندگی کے آخری ایام گوالیار کے شاہی قیدخانے میں گذارے۔

اس طرح گولکنڈہ کی حد تک مسلۂ وراثت اس شادی سے غیر متاثر ہی رہا۔

عبداللہ کی تیسری لڑکی کی شادی | عبداللہ کی تیسری لڑکی ایک شخص سید سلطان کو دی جانے والی تھی۔ علامہ آزاد نے اس کو سادات نجف اشرف سے بتلایا ہے اور یہ کہ وہ سید نظام الدین احمدؒ کے ساتھ میر جملہ کے طلب کرنے پر حیدرآباد آیا مگر ہم نے اس بیان سے پہلے ہی اختلاف کیا ہے۔ اس معاملہ میں خان خافی کی رائے زیادہ وقیع معلوم ہوتی ہے وہ لکھتا ہے۔

"بعد از چندگاہ سید سلطان نام کہ او نیز از اکابران داعیان عربستان بود۔ بہ حیدرآباد رسیدہ بہ اعزاز تمام در مجلس قطب الملک راہ آمد و شد بہم رساند"۔ (خافی خان جلد سوم)

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید سلطان نظام الدین احمد کے ساتھ نہیں بلکہ کچھ مدت بعد حیدرآباد آیا اور رفتہ رفتہ دربار قطب شاہی میں اس کی آمد و رفت ہو گئی۔

اس وقت بادشاہ کی تیسری لڑکی ناکتخدا تھی بادشاہ کو سید سلطان کے عاداتؒ اطوار پسند آئے۔ اور اس نے ارادہ کر لیا کہ اپنی تیسری لڑکی کی شادی اس شخص سے کر دے چنانچہ یہ لڑکی منسوب کر دی گئی اور شادی کے انتظامات بھی مکمل ہو گئے۔ مگر اس عرصہ میں ایک اور نیا گل کھلا۔ وہ نظام الدین احمد اور سید سلطان کی چشمک تھی۔ اسی چیز نے بالآخر سید سلطان کو ناکام و نامراد اس دروازے سے واپس کر دیا۔

نظام الدین کی مخالفت | اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب سید سلطان کا طوطی دربار میں بولنے لگا، اور بادشاہ کی سب سے چھیتی لڑکی اس سے منسوب ہو گئی تو قدرتی طور پر نظام الدین احمد

نے خطرہ محسوس کیا۔ اب تک وہ بلا شرکت غیرے بادشاہ کے مزاج پر حاوی تھا اور مورخین کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر معاملات سلطنت میں اس کو کافی دخل ہو گیا تھا۔ بادشاہ نے ضعیفی کی وجہ سے بیشتر انتظامی امور سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اور قدرتی طور پر اس کا اثر یہ ہوا تھا کہ نظام الدین احمد سیاہ و سفید کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ ان حالات کے مد نظر وہ یہ توقع کر سکتا تھا کہ عبداللہ کے بعد تخت و تاج کا مالک بھی وہی قرار دیا جائے گا۔ مگر جب سید سلطان کی آمد نے حالات کے رخ کو کسی قدر بدل ڈالا تو اس نے اس امر کی کوشش کی کہ سید سلطان کے اس بڑھتے ہوئے رسوخ کو کسی نہ کسی طرح ختم کر ڈالے اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس نے ان دونوں کی دشمنی میں اضافہ کیا اور جو بالآخر سید سلطان کے حق میں بہت مضر ثابت ہوا۔ اس واقعہ کو خافی خان کے الفاظ ہی میں پیش کر دیا جاتا ہے۔

روزے قطب الملک از سید سلطان در خلوت استفسار نمود کہ شما میرزا احمد را در وطن می شناختید، و از خاندان ایشان اطلاع دارید۔ او در جواب گفت ایشان فضیلت موروثی دارند و استادزادہ ما می شوند۔ یاران نمام پیشہ مضمون این سوال و جواب را بہ میرزا احمد بہ آب و تاب رسانیدند۔ و بر طبع میرزا احمد بسیار گرانی نمودہ و گفت کہ پدر من برائے درس دادن سید سلطان نوکر بود۔ (خافی خان جلد سوم)

سید سلطان کی ناکامی

سید سلطان نے بدقسمتی سے جو جواب دیا۔ اس میں نظام الدین نے اپنی اور اپنے خاندان کی تحقیر دیکھی وہ تو پہلے سے ہی جلا بیٹھا تھا اب اور برافروختہ ہوا۔ عین عقد خوانی کے روز نظام الدین نے بادشاہ کو اطلاع کی کہ اگر یہ شادی نہ روک دی جائے تو وہ مع اپنے لواحقین کے دربار عالمگیری سے ملحق ہو جائے گا۔ یہ دھمکی عبداللہ قطب شاہ

کو پریشان کرنے کے لئے کافی تھی۔ اس زمانے میں مغلوں کا جو کچھ خطرہ ان دکنی سلطنتوں کو ہو سکتا تھا اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو اس دور کی سیاسیات سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتا ہو۔ نظام الدین کو اس کے اپنے ارادے پر عمل کرنے کا موقعہ دینا گویا ملک میں ایک غیر ضروری فتنہ و فساد کا پیدا کرنا تھا۔ عبداللہ یہ جانتا تھا کہ اگر نظام الدین واقعی مغلیہ سلطنت سے تعلق پیدا کرلے تو قطب شاہی سلطنت کو اس سے سخت نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ کوئی تعجب نہیں جو مغل اس کی حمایت کے حیلے سے ریاست پر حملہ کر بیٹھیں اور نظام الدین جو اس عرصہ میں ملک کی اندرونی دبیرونی کمزوریوں سے واقف ہو چکا تھا، ایک دشمن کی حیثیت سے واقعی بہت خطرناک ثابت ہوتا۔ ان حالات کے مدنظر بادشاہ کو مجبوراً اس کی بات ماننی پڑی۔ درباری امرا نے بھی اس کو یہی رائے دی، اس طرح نظام الدین کا افسوں کارگر ہو گیا اور سید سلطان کی بنی بنائی قسمت پر خاک پڑ گئی[۱]۔ چونکہ شادی کا تمام انتظام مکمل ہو چکا تھا۔ اس لئے فوراً ابوالحسن کو طلب کیا گیا اور لڑکی اس سے بیاہ دی گئی۔

ابوالحسن سے متعلق اختلافات اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابوالحسن کون تھا؟ مختلف تاریخوں میں مختلف بیانات اس کے متعلق ملتے ہیں چند اہم اقتباسات جو اس اختلاف سے متعلق ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

لالہ جگ جیون داس مصنف منتخب التواریخ[۲] نے ابوالحسن سے متعلق جو سطور قلمبند کئے

---

[۱] ٹیورنیر نے بیان کیا ہے کہ ایک شخص عبدالجبار بیگ جو فوج کا ایک بڑا عہدہ دار تھا اس شادی کا مخالف ہو گیا۔ اس کی مخالفت کی بنا پر سید سلطان کی بجائے بادشاہ کی لڑکی ابوالحسن کو دی گئی۔ سفرنامہ ٹیورنیر

[۲] یہ تاریخ شاہ عالم بہادر شاہ کے دور میں لکھی گئی۔ اور آجکل نایاب ہے۔ ہندوستان میں شاید صرف کتب خانہ آصفیہ ہی میں ایک نسخہ اس کا موجود ہے۔

ہیں وہ یہ ہیں۔

"ابوالحسن مرد بیگانہ از کار ہا وارستہ از قوم مغل ہمدانی بود۔ بعد مردن عبداللہ قطب الملک دخترش بعقد ازدواج درآوردہ بہ حکومت آں ملک رسید۔

مفتاح التواریخ میں حسب ذیل عبارت پائی جاتی ہے۔

"والی ایں دیار سلطان ابوالحسن از نجیب زادہائے ایران بود۔ درلباس فقر بہ سیاحت آمدہ چوں والی حیدرآباد قطب الملک عبداللہ شاہ را پسرے نہ بود۔ بر فطنت و ذکائے او مفتون شدہ او را بہ دامادی گرفت"

اونگٹن[1] نامی ایک شخص نے ۱۶۸۹ء میں سورت کا ایک سفر کیا ہے۔ اس نے گولکنڈہ کے کچھ حالات لکھے ہیں۔ اس نے ابوالحسن کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابوالحسن کا باپ عرب کا باشندہ تھا۔ گولکنڈہ آکر یہاں ملازم ہو گیا اس کے مرنے کے بعد اُس کا بیٹا ابوالحسن کچھ عرصہ تک پریشان رہا۔ بعد میں سید مظفر اور دیگر امرا کی کوشش سے پایۂ امارت کو پہونچ گیا۔ اور بادشاہ کی تیسری لڑکی اُس سے بیاہ دی گئی۔

ماثر عالمگیری کا مصنف ابوالحسن کو عبداللہ کا بھتیجا بتاتا ہے۔ چنانچہ اُس کے الفاظ یہ ہیں "اُبوالحسن برادرزادہ و داماد او (عبداللہ) برمسند پایہ اندوزی ریاست بہ نشست[2]"

خافی خاں مبہم طریقہ سے صرف اس قدر لکھتا ہے کہ... ابوالحسن کہ از طرف مادر سلسلہ او تا قطب شاہیہ می رسید[3]...... حدیقۃ العالم اور تاریخ قطب[4] شاہی کے مصنفین نے خافی خاں کی پیروی کی ہے۔ اور ابوالحسن کو شاہی خاندان کا ایک فرد بتایا ہے منوچی[5] اور ٹیورنیر[6] کے

---

[1] مصنفہ ولیم بیل [2] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو سفر نامہ اونگٹن۔ جس کو مسٹر بندرے نے اپنی مرہٹی کتاب "قطب شاہی سلطنت سترھویں صدی میں" کے ساتھ شائع کیا ہے [3] ص ۲۴۳ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی [4] جلد سوم منتخب اللباب [5] مصنفہ قادر خاں بیدری [6] "اسٹوریا" جلد سوم ص ۱۳۲ [7] سفر نامہ ٹیورنیر

بیانات اس سلسلہ میں بالکل ایک سے ہیں۔ دونوں نے ابوالحسن کو گولکنڈہ کے شاہی خاندان کا ایک فرد بتلایا ہے۔ اب ان بیانات کو سامنے رکھ کر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا بظاہر دشوار معلوم ہوتا ہے لیکن مجموعی حیثیت سے ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد ان مختلف بیانات کو دو اہم شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اوّل ایسی روایتیں جو ابوالحسن کو غیر ممالک کا باشندہ یا جگ جیون داس کے الفاظ میں "مرد بیگانہ" ظاہر کرتی ہیں۔ دوسری وہ روایتیں جو اس امر پر اتفاق کرتی ہیں کہ ابوالحسن قطب شاہی خاندان کا ایک فرد تھا۔ گرزشتہ کے تعیّن میں نہ صرف اختلاف کرتی ہیں بلکہ اس کے اظہار سے ہی قاصر ہیں۔ ایک سرسری تنقیدی نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جائیگی کہ موخر الذکر روایات کو ہر حیثیت سے اوّل الذکر پر ترجیح اور فوقیت حاصل ہے اور اسی اعتبار سے وہ زیادہ قابل قبول اور قابل اعتماد ہیں۔

منتخب التواریخ، مفتاح التواریخ، اور سفرنامہ اوِنگٹن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابوالحسن ایران یا عرب کا باشندہ تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تاریخی حیثیت سے ان پر کہاں تک اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے منتخب التواریخ کو لیجئے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس کا مصنف شاہ عالم بہادر شاہ کے دور کا آدمی ہے لیکن پھر بھی قطب شاہی بادشاہوں کا جہاں اس نے ذکر کیا ہے وہاں اکثر غلطی کر گیا ہے۔ اس کی غلطی مندرجہ ذیل عبارت سے صاف طور پر واضح ہو جائے گی۔ محمد قطب شاہ کے حالات کے سلسلے میں وہ یوں رقمطراز ہے "سلطان محمد قطب الملک در جناب شاہجہاں بادشاہ رسوخیت داشت۔ سوائے باج و خراج مقرری پیش کشہا ارسال می نمود۔ و سکہ و خطبہ بنام نامی حضرت شاہجہاں بادشاہ در مملکت خود رواج داد۔ تمام عمر تقصیرے از و در مقدمہ میر جملہ رو داد موجب خرابیٔ ملک شد"۔ اس تمام بیان سے ظاہر ہے کہ محمد قطب الملک کے بجائے اصل میں وہ عبداللہ قطب الملک کے حالات لکھ رہا ہے

مگر پھر بھی غلطی سے اُن کو قطب شاہ سے منسوب کر دیتا ہے، طرفہ یہ کہ طبقۂ قطب شاہیہ میں عبداللہ کا ذکر ہی نہیں کرتا بلکہ محمد کے بعد راست ابوالحسن پر اتر آتا ہے۔ اس اعتبار سے جگ جیون داس کا بیان قابلِ التفات نہیں رہتا۔ مفتاح التاریخ کا مصنف انگریز ہے اور یہ بہت بعد کی تاریخ ہے اس لئے اس کی بھی اہمیت معاصر مورخوں کا مقابلہ کرتے کچھ باقی نہیں رہتی۔ اب رہا ونگٹن سو اس کو منوچی اور ٹیورینر پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ ابوالحسن، ٹیورینر، منوچی، خافی خان اور دیگر مصنفین کے خیال کے مطابق خاندان قطب شاہی کا ہی ایک فرد تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ اس رشتہ کی اصلی نوعیت کو متعین کرنا موجودہ مواد کے مدنظر امکان سے باہر ہے۔

ابوالحسن وارث تخت وتاج کی حیثیت سے یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ یہی ابوالحسن جس نے کم و بیش پندرہ سال نشانِ ناکامی زندگی بسر کی تھی، بالآخر عبداللہ کے مرنے کے بعد وارث تخت و تاج ٹھہرایا گیا۔ محمد سلطان جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے اپنی زندگی کے آخری دن گوالیار کے قید خانہ میں گذارنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ عبداللہ کے بعد تخت کا ایک اور دعوے دار نظام الدین موجود تھا۔ مگر امرا نے بالاتفاق ابوالحسن کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا اور نظام الدین کی تخت و تاج حاصل کرنے کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ گولکنڈہ کی یہ ایک بدقسمتی تھی کہ اس کا آخری تاجدار ایک ایسا نااہل اور نالائق شخص ہوا کہ جس کو اس کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ ایک طوفان خیز اور متلاطم دریا میں مملکت کی کشتی کو صحیح و سلامت حالت میں کس طرح ساحل کامیابی تک پہنچاتے ہیں۔

سید علی محسن ایم۔اے

نواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہیدؒ

ہندوستان کی عام حالت | شہنشاہ اورنگ زیبؒ کے انتقال کا اعلان درحقیقت سلطنت مغلیہ کے خاتمہ کا پیغام تھا۔ برادرانہ جنگ، اُمرا کی سازشیں، مرہٹوں کا عروج، حصول اقتدار کی کوششیں، اکبر و جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کے نام لیوا جانشینوں کی نالائقی اور ناخلفی، ملک میں انتشار اور آخر کار ہندوستان سے اس عظیم الشان سلطنت کے خاتمہ کا باعث ہوئے جس کی آبیاری مغل اور راجپوت سورماؤں نے اپنے خون سے کی تھی بادشاہ کٹ پتلی بن گئے۔ "تخت اور تختہ" میں کچھ زیادہ فرق و فاصلہ نہ رہا۔ اسی زمانے فرنگی اقوام کا عروج بھی شروع ہوا۔ عالمگیر کے عہد تک ان کی "رندانہ جرائتیں" صرف بحر ہند یا زیادہ سے زیادہ ساحلی مقامات تک محدود رہیں۔ جب کبھی شاہ جہاں یا عالمگیر کے عہد میں انھوں نے آگے بڑھنے کی جرأت کی فوراً سر کوبی کی گئی مگر اب حالت ہی دوسری تھی۔ اقتدار شاہی "دہلی تا پالم" سے زیادہ نہ تھا۔ تیموری جرأت و حمیت کا خاتمہ ہو چکا تھا بادشاہ گر اُمرا جس کو چاہتے گھڑی میں بادشاہ کرتے اور گھڑی میں آب شمشیر پلاتے۔ خود سروں اور شورش پسندوں کو موقع ملا۔ جو علاقہ جس کے ہاتھ لگا اس نے اپنے قبضہ میں کیا اور دہلی کے اثر سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس وقت شہنشاہ اورنگ زیب کے چند لائق ترین سرداروں میں ایک نظام الملک آصف جاہ اوّل تھے۔ دربار دہلی کی رنگ رلیاں، سازشیں اور عیش پرستیاں دیکھیں تو نقشہ اچھا نظر نہ آیا اور بادشاہ گروں کی آتش عناد سے بچ کر بہادر شاہ کی بیوہ ملکہ کے ایما سے دکن چلے آئے جہاں

عمر کا ایک بڑا حصہ اپنے آقا شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ گذارا تھا۔ سید برادروں نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا لیکن ان کو اپنے مقصد میں زیادہ کامیابی نہ ہوئی، گو مرہٹوں سے چوتھ اور سردیشکھی کا وعدہ کرکے ہمیشہ کے لئے ایک بلا صوبہ دار دکن کے سر منڈھ گئے۔
عالمگیر نے ۱۰۹۸ھ میں گولکنڈہ فتح کیا جس سے سلطنت مغلیہ کی سرحد میسور تک پہنچ گئی لیکن ۱۱۵۶ھ میں یعنی فتح کرناٹک کے بعد دکن کا شرقی علاقہ راس کماری تک صوبجات دکن میں شامل ہو کر قلمروئے آصفی کا جزو بن گیا۔

نواب آصف جاہ بہادر کے پانچ بیٹے تھے جن میں سے دوسرے بیٹے نظام الدولہ میر احمد خاں بہادر ناصر جنگ مشہور بہ شہید اس دور کی ایک عظیم الشان ہستی ہیں۔ جن میں علم و عمل دونوں جمع ہو گئے تھے کیونکہ نواب نظام الملک بہادر نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔

"نواب نظام الملک بہادر چوں حرکات او (نواب ناصر جنگ بہادر) را بامعان نظر و بقیاس خرد سنجید و ہمہ را بامناسبات بزرگی و دلیری و سپہ کشی و جہانگیری درست دید روز بروز بر مراتب روز افزوں او بیفزود" یہاں تک کہ جس وقت ۱۱۵۰ھ میں محمد شاہ نے نواب آصفجاہ بہادر کو دہلی طلب کیا تو دکن کا سارا انتظام نواب ناصر جنگ کے سپرد کر کے دہلی چلے گئے۔ انھوں نے نواب آصف جاہ بہادر کی غیر موجودگی میں بہت سرگرمی اور تندہی سے کام کر کے دکن کے صوبوں کا نہایت اعلیٰ انتظام کیا۔ یہاں تک کہ "ہمہ اعتراف نمودند کہ دکن را بامردمش ہرگز در عمر خود بداں امنیت و آسایش ندیدہ بودند"

مرہٹے | مرہٹوں نے سابق عہدنامے کی خلاف ورزی کر کے مالوہ پر قبضہ کر لیا اور

لہ شرح حال نواب ناصر جنگ از آقا نصر اللہ خاں فدائی۔

مملکت آصفی میں بھی آفت و آفات شرارت کی ان کا خیال تھا کہ نواب آصفجاہ بہادر دہلی میں ہیں لہذا یہاں کوئی ان کا سد راہ نہ ہوگا لیکن انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہاں اُن کو منہ کی کھانا پڑے گی۔ باجی راؤ نے برہان پور پر حملہ کیا اور اس علاقہ میں لوٹ مار شروع کی۔ لیکن اسی زمانہ میں نادر شاہ کی واپسی کی خبر پہنچی۔ باجی راؤ پریشان ہو کر پونا واپس چلا گیا۔ نواب ناصر جنگ نے غلام محمد نقشبند خاں کو تہدید آمیز پیغامات دے کر باجی راؤ کے پاس بھیجا جس نے برہان پور کا مقبوضہ علاقہ واپس کر دیا لیکن ابھی دم نہ لیا تھا کہ پھر شرارت سوجھی اور پچاس ہزار سواروں کے ساتھ اورنگ آباد کی طرف بڑھا۔ نواب ناصر جنگ بہادر نے فوراً پیش قدمی کی۔ افواج ناصری کی تعداد دس ہزار سے زائد نہ تھی لیکن پہلے ہی مقابلہ میں گھمسان کا رن پڑا۔ مرہٹوں کے دانت کھٹے ہو گئے اور انھوں نے فرار پر قرار پکڑا۔ نواب ناصر جنگ نے تعاقب کیا جس سے باجی راؤ سخت پریشان ہوا اور معافی مانگی۔ نواب ناصر جنگ بہادر معاودت کرکے "بانواع عنایات شاہانہ اش نواخت و سرکار کھرکون و سرکار ہانڈیہ را در وجہ نان پارہ او مقرر نمودہ بولایت خودش روانہ نمود" باجی راؤ کو اس شکست سے ایسی شرم آئی کہ اس نے بہت جلد ۱۱۵۳ھ میں شکستہ دل ہو کر انتقال کیا

سازشی صدی | بیجا نہ ہوگا اگر ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارویں صدی کو "سازشی صدی" کے نام سے یاد کیا جائے۔ اس دور میں سازشوں کی اتنی کثرت ہے کہ بلا مبالغہ ہر امیر اور عہدہ دار سازشی اور ہر حکمران سازشوں کا شکار نظر آتا ہے۔ نواب آصف جاہ بہادر کے دلی جانے پر مصالح ملکی اور ضروریات وقت کے تحت نواب ناصر جنگ بہادر نے انتظام مملکت میں کچھ تبدیلیاں کی تھیں بدخواہوں اور فتنہ انگیزوں نے نواب آصفجاہ بہادر کے بیٹے کے خلاف کان بھرنے شروع کیے۔ باجی راؤ کی موت کی خبر پا کر انھوں نے دکن آنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا لیکن لوگوں نے شکایتیں کیں کہ نواب ناصر جنگ نے

آپ کے مقرر کئے ہوئے بعض عہدہ داروں کو معزول کر دیا ہے بعض کو خطابات دیئے ہیں اور بعض کو جاگیریں اور عطئے دیئے ہیں اور ان کا ارادہ خود مختاری کا ہے۔ مجبوراً نواب آصفجاہ بہادر کو اس طرف توجہ کرنی پڑی۔ اور وہ اکبر آباد سے عین برسات میں روانہ ہو کر ۳ ر شعبان ۱۱۵۳ھ کو برہان پور پہنچ گئے۔ ادھر نواب ناصر جنگ کے درباری امراء نے دیکھا کہ نواب آصفجاہ بہادر کا دکن آنا ہمارے عروج کے خاتمے اور زوال کی تمہید ہے اس لئے نواب ناصر جنگ کو آمادہ کیا کہ پدر بزرگوار سے دہلی واپس جانے کی درخواست کریں۔ نواب ناصر جنگ اسی ہزار سوار اور توپ خانہ لے کر برہان پور کی طرف بڑھے اور کہلا بھیجا "چوں صدارت عظمائے دارالسلطنۃ دہلی بر آنحضرت مقرر است و تشریف وزارت کبریٰ بوجود انسرور مفتخر۔ بہتر آں است کہ بارادہ مکن ہماں مکان رفیع از عزیمت خود روگرداں شدہ بدارالسلطنت مراجعت فرمایند و حکومت مملکت دکن را بدست تمشیت ما گذارند" نواب آصف جاہ بہادر نے مناسب جواب دیا اس کے بعد دونوں طرف سے قاصد آتے جاتے رہے لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اس عرصہ میں امرائے آصفجاہی کو نمک کا خیال آیا اور وہ اپنے افعال پر شرمندہ ہو کر علانیہ نواب آصف جاہ بہادر سے جا ملے یہاں تک کہ نواب ناصر جنگ اکیلے رہ گئے اور لباس درویشی پہن کر روضہ شاہ برہان الدین غریبؒ میں پناہ گزیں ہوئے۔ نواب آصفجاہ نے جملہ امرائے ناصری کو برطرف کر دیا اور ۱۱۵۴ھ میں اورنگ آباد پہنچے۔ برسات کے موسم میں حسب معمول نواب نظام الملک نے سپاہیوں کو اپنے اپنے گھر جانے کی اجازت دی اور خود اورنگ آباد میں اکیلے رہ گئے اس وقت نواب ناصر جنگ نے بہت جلد سات ہزار سوار فراہم کر کے اورنگ آباد کی طرف یلغار کیا۔ جنگ بہت زور شور سے ہوئی

لیکن جہاندیدہ اور تجربہ کار "مرد بزرگ" نے ناتجربہ کار اور نوجوان ناصر جنگ کی فوج کو شکست دی۔ نواب ناصر جنگ بڑی بہادری سے لڑتے رہے فیل بان مارا گیا اور خود ان کو دو تیر لگے۔ قریب تھا کہ جنگ میں کام آئیں کہ نواب ہدایت محی الدین خاں نے جان بچا لی۔ سید لشکر خاں نے اپنا ہاتھی نواب ناصر جنگ کے ہاتھی کے برابر لا کر عرض کیا "ایں فیل برائے سواری جناب است" نواب ناصر جنگ اپنے ہاتھی سے اتر کر اُس کے ہاتھی پہ سوار ہوئے اور لشکر آصفی میں فتح کے شادیانے بجنے لگے۔ اس فتح کا ایک بڑا سبب نواب آصفجاہ کا اعلیٰ اور زبردست توپ خانہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ جنگ شام کے وقت شروع ہوئی اور اندھیرے کی وجہ سے ناصری فوج اپنے پرائے کی تمیز نہ کر سکی اور اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

میسور | چند روز تک نواب آصفجاہ بہادر اپنے بیٹے سے ناراض رہے لیکن آخرکار محبت پدری غالب آئی اور ۱۱۵۸ھ میں معاف کرکے اورنگ آباد کا صوبہ دار بنا کر رخصت کیا۔[۵۲] یہی نہیں بلکہ ان باغی سازشی امرا کو جن کی تحریریں قلمدان سے نکلی تھیں بے تحریریں دیکھے ہوئے معاف کرکے ان تحریروں کو تلف کر دینے کا حکم دیا۔ اور ۱۱۵۹ھ میں حیدر آباد سے دھارور گئے، جہاں نواب ناصر جنگ کو اپنے پاس بلایا اور "بنا بر مصلحت ملکی جانب دکھن ترخیص نمودند"۔ یہاں سے نواب آصفجاہ نے ان کو میسور کی طرف روانہ کیا تاکہ راجہ سے خراج و نذرانہ وصول کریں جس نے ادائیگی میں لیت و لعل

---

۵۲ اورنگ آباد میں ۹ رجب ۱۱۵۹ھ کو میرزا جلال اسیر کے تتبع میں جو غزل لکھی اس کے دو شعر یہ ہیں :-

میزند موج صفا آئینہ گلہائے صبح — میتواں راز دو عالم خواند از سیمائے صبح

دور سازد از دل بلبل غم یکسالہ را — گرچہ باشد یک دو من خندیدن گلہائے صبح

شروع کیا تھا۔ دیوان میں متعدد غزلیں ملتی ہیں جو انھوں نے راستہ میں پدر بزرگوار کی غزلوں کے تتبع میں کہی ہیں مثلاً پرگنہ او دگیر جاگیر راجہ رام چندر عالمگیری میں جو غزل محرم ۱۱۵۹ھ میں کہی اس کا مطلع یہ ہے ؎

رہ بر ویش کرد چوں آئینہ حیرانی مرا عاقبت آمد بکار ایں پاک دامانی مرا

غرضکہ رزم و بزم بناتے اور یلغار کرتے ہوئے بہت جلد میسور پہنچ گئے اور سرنگاپٹن سے تین کوس کے فاصلے پر ڈیرے ڈالے۔ یہاں انھوں نے کئی غزلیں کہیں، غالباً یہیں راجہ سے بھی گفت و شنید ہوئی۔ اور شعبان کے آخر تک یہاں قیام کیا راجہ کو اطاعت کئے بغیر نہ بن پڑی۔ اس نے پیش کش حاضر کی اور یہ کامیاب اورنگ آباد واپس آئے اور یہیں سے نواب آصفجاہ بہادر کے ساتھ برہان پور گئے، جہاں ۱۱۶۱ھ میں نواب آصفجاہ بہادر کا انتقال ہوا۔

جانشینی | وفات سے پہلے انھوں نے نواب ناصر جنگ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا چنانچہ یہی مسند نشین ہوئے۔ مگر ملک کی بد قسمتی سے اس وقت نواب مظفر جنگ نے بھی دعویٰ صوبہ داری کیا۔ میلے سن لکھا ہے "کہا جاتا ہے کہ آصفجاہ ان کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے اور اس کے لئے دربار دہلی سے اجازت بھی لے لی تھی" مگر یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے کہ جس زمانہ میں نواب ناصر جنگ معتوب تھے نواب آصفجاہ بہادر نے ایسا خیال ظاہر کیا گیا ہو مگر معافی کے بعد باپ بیٹے کے تعلقات بہت اچھے رہے چنانچہ نواب ناصر جنگ بہادر باپ کے بستر مرگ پر بھی حاضر تھے۔ اس کے علاوہ بیٹے کی موجودگی میں نواسے کو جانشینی کا حق بھی نہیں پہنچتا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ابھی وہ بالکل نوجوان اور ناآزمودہ ہو۔ ۵۳

---

۵۳ یہ صحیح ہے کہ شہنشاہ نے مظفر جنگ کے نام پروانہ بھیج کر دہلی بلایا تھا۔ (بقیہ نوٹ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۵۷ پر)

اسی زمانہ میں شہنشاہ دہلی نے شقہ بھیج کران کو دہلی طلب کیا اور یہ فوراً اورنگ آباد سے لاؤ لشکر لے کر برہان پور پہنچے تاکہ شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوں دریائے نربدا کے کنارے ڈیرے ڈالے اور خیال تھا کہ عبور کریں کہ ۱۸ رجادی الآخر ۱۱۶۲ھ کو خاص شہنشاہ کے قلم سے لکھا ہوا شقہ آیا جس میں صوبجات دکن تفویض کئے جانے کی طرف اشارہ تھا۔ اس کے علاوہ شہنشاہ نے حکم دیا تھا کہ اب دہلی میں تمہاری ضرورت نہیں لہذا واپس جاکر ملک پر انتظام وانصرام میں مصروف ہو۔

ڈوپلے مغل حکومت مائل بہ زوال تھی۔ مرہٹے لوٹ مار کر رہے تھے انگریزوں اور فرانسیسیوں میں تجارتی مقبوضات اور مراعات پر لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ دونوں قومیں نہ صرف آپس میں لڑتی تھیں بلکہ انھیں مجبور ہو کر ہندوستانی سپاہیوں کو بھی اپنی فوجوں میں بھرتی کرنا پڑا تھا۔ ان میں صلح ہوئی تو ڈوپلے کو فکر ہوئی کہ ان بیکار فوجوں سے کیونکر کام کیا جائے کیونکہ یورپ میں ان دونوں رقیب قوموں کے مطلع پر جنگ کے بادل اب بھی گھرے نظر آتے تھے۔ اس نے بہت جلد دوراندیشی سے ایک تدبیر نکالی اور جس طرح اس نے اپنا روپیہ سود پر چلانا شروع کیا اور اس سے دولت بڑھانی شروع کی تھی اسی طرح فوج کو بھی مختلف راجوں اور نوابوں کو دے کر اس کا معاوضہ وصول کرنا شروع کیا، اس زمانہ میں نواب مظفر جنگ کو چندا صاحب نے ورغلایا جو مرہٹوں سے مدد لیتے ستارا گئے تھے۔ ڈوپلے نے چندا صاحب کی رہائی پر سات لاکھ روپیہ بطور زرفدیہ دینے کا وعدہ کیا۔ چندا صاحب کے رہا ہونے پر دونوں اس دور کے سب

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۶) اور دکن کی صوبہ داری کا فرمان بھی ۱۱۶۱ھ میں نافذ کیا تھا لیکن بعد میں یہ نواب مظفر جنگ کے حق میں منسوخ کر دیا گیا۔ دیکھو تذکرہ شرح حیات ناصر جنگ شہید از اندرا رنگا پلے کا روزنامچہ۔

بڑے نشاط کے پاس پہنچ گئے۔ چندا صاحب کا خیال تھا کہ ارکاٹ پر قبضہ کرنے کے بعد نواب ناصر جنگ پر حملہ کیا جائے اس نے ڈوپلے سے وعدہ کیا کہ وہ دو ہزار سپاہیوں کا خرچ جن کی مغربی طرز پر فوجی تربیت ہو خود برداشت کرے گا[۵۴]۔ فرانسیسیوں کی مدد ملنے پر نواب انورالدین خاں شہامت جنگ پر حملہ کردیا اور جواں ہمت لیکن کہن سال نواب ۱۰۷ برس کی عمر میں مردانہ وار لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس فتح کے بعد نواب مظفر جنگ نے ارکاٹ میں اپنی صوبہ داری کا اعلان کر کے چندا صاحب کو کرناٹک کا نواب نامزد کیا۔ ڈوپلے غور سے دکن کی سیاسی حالت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کو ہندوستان میں ایک عظیم الشان فرانسیسی سلطنت کے خواب نظر آرہے تھے اس نے ہندوستانی رسم و رواج اختیار کر لئے تھے "مہاراجہ راجہ تسری ماشیر شیولیر ڈوپلے"[۵۵] کہلاتا اور نوابوں کی طرح نذریں قبول کرتا تھا یہی نہیں بلکہ اکثر دوسروں سے خواہش کرتا تھا کہ اس کے پاس تحفے بھیجیں۔ نواب نظام الملک آصفجاہ بہادر کے دربار میں ایک شخص امام حسین خاں ڈوپلے کا دوست تھا۔ اسے ایک خط میں لکھتا ہے "صفدر علی خاں نے ایم۔ ڈیوما کو سرپیچ، پیش قبض، کمان، سپر، نقارہ، موضع الیسیا پالم اور دیگر مواضعات دیئے تھے۔ میں نے تم کو تین ماہ قبل لکھا تھا کہ مجھے بھی نواب ناصر جنگ سے ایسے ہی تحفے ملنے چاہئیں فوراً بھجوانے کا انتظام کرو[۵۶]۔ امام صاحب کو اس قسم کا کوئی اختیار نہ تھا اس نے ڈوپلے سے خلعت کے لئے ایک ہزار اشرفی طلب کی جس پر ڈوپلے بہت خفا ہوا لیکن خلعت د

---

[۵۴] میلیسن :- ہندوستان میں فرانسیسیوں کی تاریخ

[۵۵] روزنامچہ پلّے :- ۱۰ ؍جون ۱۷۴۸ء

[۵۶] [illegible] ۱۰ [illegible] دسمبر ۱۷۴۸ء

تحائف کی خواہش اتنی زیادہ تھی کہ بہت جلد یہ رقم امام صاحب کے پاس بھیجدی۔[۵]

فرانسیسیوں سے تعلقات: شہامت جنگ کی شہادت کے بعد نواب مظفر جنگ، چندا صاحب کے ساتھ پانڈیچری گئے جہاں ڈوپلے نے شاندار استقبال کیا اور مختلف طریقوں سے اثر ڈالنے اور مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ یہی نہیں بلکہ ان کو اپنی وفاداری اور زبردست فوجی قوت کا یقین بھی دلایا۔ ادھر نواب ناصر جنگ نے بھی حملے کی تیاریاں کیں۔ نواب مظفر جنگ نے پانڈیچری میں صرف آٹھ روز قیام کیا اور فوج فراہم کی جس کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی۔ نواب آصفجاہ کے زمانے میں فرانسیسیوں سے بہت اچھے تعلقات تھے چونکہ اس وقت ان کا کام محض تجارت تھا اس لئے رضا جوئی کی فکر رہتی تھی۔ برتاؤ مساویانہ نہیں بلکہ نیازمندانہ وخادمانہ تھا۔ اکثر نذریں اور تحائف بھیجے جاتے تھے چنانچہ پیلے کی ڈائری میں کئی مواقع پر ڈوپلے کے پاس سے نواب آصفجاہ بہادر اور نواب ناصر جنگ بہادر کے پاس کتابیں، دوربینیں اور دیگر تحفے بھیجے جانے کا حال ملتا ہے لیکن نواب مظفر جنگ کے پانڈیچری جانے کے بعد سے ان کے طرز عمل میں تبدیلی ہوئی اور اب انھوں نے قدم آگے بڑھانے شروع کئے۔ مؤلف کتاب ماثرالامراء لکھتا ہے کہ "مخفی نماند کہ تا ایں وقت نصاریٰ فرانسیس وانگریز در بنادر بودند و پا از حد بیروں نمی گذاشتند۔ بہدایت محی الدین خاں اینہا رارفیق خود کردہ جری ساخت۔ بعد ازیں نصاریٰ تخت شوردو جرات بہم رسانیدند"۔ لیکن بقول میلے سن درحقیقت ہندوستان میں فرانسیسیوں کے قدم جمانے کا باعث چندا صاحب ہوا اور اس تحریک کے پیش رو اور بادی خود الیسٹ انڈیا کمپنی

---

[۵] روزنامچہ پیلے: ۱۶ر نومبر ۱۷۴۸ء

کے انگریز تاجر تھے، جنھوں نے تنجور کے راجہ ساہوجی کی مدد کی جو کئی مرتبہ گدی سے اتار کر بھگا یا جا چکا تھا۔ حکومت کی خواہش نے اسے چین نہ لینے دیا۔ فرانسیسیوں سے مدد کی اُمید نہ تھی کیونکہ وہ اس کے حریف راجہ پرتاب سنگھ کے موافق تھے۔ لہٰذا انگریزوں سے مدد طلب کی اور فوج کے پورے اخراجات اور ملک کا ایک علاقہ دینے کا وعدہ کیا۔ انگریزوں نے حملہ کیا اور اس متعدد حملے میں کامیابی ہوئی۔ پرتاب سنگھ نے گھبرا کر انگریزوں سے صلح کر لی جنھوں نے اس سے قلعہ دیوی کوٹا اور اس کا مضافاتی علاقہ جس کی آمدنی چھتیس ہزار روپیہ تھی، حاصل کیا اور وعدہ کیا کہ وہ نہ صرف ساہوجی کا ساتھ چھوڑ دینگے بلکہ مدراس میں اُسے نظر بند بھی رکھیں گے۔[۵۹]

ڈوپلے نے نواب آصف جاہ سے درخواست کی تھی کہ وہ مدراس لے کر اس کے بدلے میں پانڈیچری کے قریب دو ضلع ولیانالور اور والداور فرانسیسیوں کو دے دیں۔ امام حسین خاں نے خود کو نواب آصف جاہ بہادر کا منہ چڑھا امیر ظاہر کر کے اس سے ان کے دلانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ ڈوپلے کو عرصہ تک منظوری کا انتظار کرنا پڑا۔ دوربینوں اور کتابوں کے تحفے سے خوش ہو کر نواب ناصر جنگ نے اسپ و خلعت بھجوایا تو ڈوپلے نے ان کا اسی طرح استقبال کیا جس طرح مغل حکام شہنشاہ دہلی کے فرمانوں یا تحفوں کا استقبال کرتے تھے۔ نواب ناصر جنگ بہادر کی جانشینی پر مبارکباد کا خط بھیجا تھا اور امام صاحب کو ہدایت کی کہ اس کی طرف سے مناسب نذر پیش کرے لیکن اب نواب مظفر جنگ کے شامل ہونے پر اس نے امام حسین خاں کو ۱۴ اگست ۱۷۴۸ء کے خط میں لکھا، محمد شاہ بادشاہ اور نظام الملک کا انتقال ہو گیا۔ امن و امان رخصت ہو گئے۔ سلطنت کا جو حصہ جس کے

---

۵۹ میلیسن: ہندوستان میں فرانسیسیوں کی تاریخ (انگریزی)

ہاتھ لگا اس نے قبضہ کر لیا۔ پھر بھی اگر چاہتا تو کسی علاقہ پر قبضہ کر لیتا لیکن یہ اچھی بات نہیں۔ بہتر ہے کہ نواب ناصر جنگ سے ولایات ادارہ والا اور دولاوود دینہ میں بھی دوسروں کی طرح عمل کروں گا۔[۱۱۰]

اس زمانہ میں انگریزوں نے دربار ناصری میں رسائی پیدا کرکے اپنی بہادری کے ترانے گانے اور فرانسیسیوں کی بزدلی کے افسانے سنانے شروع کئے اس امید پر کہ صوبہ دار دکن سے کچھ مراعات حاصل ہو جائیں۔ فرانسیسی بھی غافل نہ تھے چنانچہ اس زمانہ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی انگریزوں کے خلاف اسی طرح جھوٹی سچی خبریں اڑا کر انہیں ذلیل و بدنام کرنا شروع کیا اور ۱۲ر نومبر کو امام صاحب کے پاس ایک خط بھیجا جس میں مدراس اور اس کے مضافات کے بدلے میں کوئی میدان اور کچھ دیگر گاؤں طلب کئے اور نامنظوری کی شکل میں زبردستی قبضہ کر لینے کی دھمکی دی تھی۔ نواب ناصر جنگ کو لکھا تھا کہ انورالدین نالائق آدمی ہے لہٰذا اس کو حکم دیجئے کہ ہمارے خلاف انگریزوں کی مدد نہ کرسکے۔[۱۱۱]

اس وقت کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اواخر جون میں مملکت دکن میں سیاسی ہیجان اور فتنہ انگیزی کے لاوے شروع ہو گئے تھے۔ نواب سراج الدولہ انورالدین خاں نے نواب مظفر جنگ سے اولاً اطاعت کا اظہار کیا تھا لیکن بعد میں جنگ ہوئی۔ نواب مظفر جنگ نے چندا صاحب کو حسین دوست خاں کا خطاب اور ارکاٹ، تنجور، جنجی، ترچناپلی اور مدورا مع پورے علاقوں اور قلعوں کے مرحمت

---

۱۱۰ روزنامچہ پلے: ۴ر اگست ۱۷۴۸ء جلد پنجم، صفحہ ۱۷۵

۱۱۱ ایضاً

فرمایا، اس وقت نواب ناصر جنگ دہلی جانے کے ارادے سے دریائے نربدا کے کنارے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ یہ خبریں سُن کر اورنگ شہنشاہ دہلی کے احکامات پاکر ادھر متوجہ ہوئے۔ چندا صاحب کے مددگار مانگنے پر ڈوپلے نے وہ رسالہ جسے برطرف کرنا چاہتا تھا اس کے سپرد کیا اور رنگا پلے کو حکم دیا کہ پوری رقم کا عہد نامہ لے کر دیا نا لر کے لئے چندا صاحب کے بیٹے سے پروانہ حاصل کرو۔"

یلغار ناصری | ۱۰ راکتوبر ۱۷۴۹ء کو پانڈیچری خبر پہنچی کہ نواب ناصر جنگ اورنگ آباد سے دھاوا مارتے ہوئے ۳۰ ہزار سوار کے ساتھ چلے آرہے ہیں اور سات منزلیں طے کر لی ہیں اور مرار ہی راؤ تین ہزار سوار اور دس ہزار پنڈاروں کے ساتھ لوٹ مار کرتا ارکاٹ کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔ اس سے فرانسیسی اور چندا صاحب بہت پریشان ہوئے لیکن ڈوپلے اپنا جال پھیلانے میں مصروف رہا اس نے چندا صاحب کو رنگا پلے سے بلوایا جس نے کہا کہ میں ضرور آؤں گا خواہ شوربا کی نماز میں نصف گھنٹہ دیر ہی کیوں نہ ہو جائے۔ مجھے فی الحال دو لاکھ پگوڈوں کی ضرورت ہے جن کے بدلے دس لاکھ کی زمینیں دینے کو تیار ہوں دو ماہ بعد رقم ادا کر کے زمین واپس لوں گا۔ فرانسیسی فوجیں اورنگ آباد تک یلغار کریں گی مسولی پٹم اور دوسرے بندرگاہ فرانسیسیوں کو دے دیئے جائیں گے۔ اسی علاقہ میں انھیں ایک جاگیر بھی دوں گا۔ اس کے علاوہ نربدا سے میسور تک تمام علاقہ جس پر آصفجاہ کی حکومت تھی فتح کروں گا[۱۱۲] شام کو چندا صاحب ڈوپلے سے ملا اور مشورہ دیا کہ شہنشاہ دہلی کی خدمت میں عرضداشت لکھے کہ چونکہ شہنشاہ نے مظفر جنگ کو صوبہ دار بنایا ہے اس لئے فرانسیسیوں نے مظفر جنگ

---

۱۱۲ روزنامچہ پلے: جلد ہشتم ۱۰ راکتوبر ۱۷۴۹ء

کی انگریزوں اور انورالدین خاں کے خلاف مدد کی ہے۔ ناصر جنگ، انورالدین خاں اور انگریز اس کے مخالف ہو گئے ہیں۔ ڈوپلے نے اس کے اس خیال سے اتفاق کیا اور عرضداشت بھیجی گئی۔

جس وقت ترچناپلی میں خبر پہنچی کہ نواب ناصر جنگ دریائے نربدا کے کنارے مقیم ہیں اور کڑپہ اور کرنول کے صوبہ داروں کو حکم دیا ہے کہ ہدایت محی الدین خاں کے نام علاقہ پرمع ادونی کے قبضہ کرلیں" نواب مظفر جنگ سخت پریشان ہوئے اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ ادونی جانے کو تیار ہو اور چندا صاحب سے مل کر کہا کہ "میں خود نواب ناصر جنگ کے پاس جاکر معاملات کا تصفیہ کرلوں گا۔ تم نے اپنا صوبہ فرنگیوں کی مدد سے حاصل کیا ہے اس لئے اپنے معاملات کی خود دیکھ بھال کرسکتے ہو" چندا صاحب نے یہ سن کر کہا کہ تم ہرگز ایسا نہ کرو۔ نواب ناصر جنگ یہاں تک کم از کم چار ماہ میں پہنچ سکیں گے۔ اس عرصہ میں ہم متحدہ طور پر فوجیں جمع کریں گے اور دشمن کو تباہ کرکے اورنگ آباد تک فتح کرلیں گے۔ چندا صاحب کے اس طرح مجبور کرنے پر نواب مظفر جنگ مان گئے اور ایک دوسرے کی ہر حال میں مدد کرنے کا وعدہ کرکے قرآن شریف ہاتھوں میں لے کر قسمیں کھائی گئیں۔

اس زمانہ کی خط و کتابت سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ نعمت اللہ نواب راجمندری، چندا صاحب کے دشمن اور عبدالمجید خاں ابن عبدالنبی خاں نواب کڑپہ چندا صاحب کے ہوا خواہ تھے۔ موخرالذکر نے چندا صاحب کو مشورہ بھی دیا تھا کہ قلعہ جنجی پر جو ہندوستان کے مضبوط ترین قلعوں میں سے ہے قبضہ کرلیا جائے۔ ۷ر دسمبر ۱۷۴۹ء کو نواب ناصر جنگ کا ایک خط ڈوپلے کے نام وصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ "میں نے سنا ہے کہ میرے مسلسل پیغامات

---

[13] روزنامچہ رنگا پلے حاشیہ صفحہ ۱۳۹ ، ۸ ر ذمبر ۱۷۴۹ء

کے خلاف تم ان لوگوں کے شریک ہو گئے ہو جو بادشاہی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ تمہارے لئے ایسا کرنا مناسب نہیں ہے غیر مفید ہی نہیں مضر بھی۔ آئندہ کے لئے تم ان سے علیحدہ ہو جاؤ اور پہلے کی طرح میرے ساتھ وفادار رہو، امن سے رہو، مجھے خط لکھو اور میرا اعتماد حاصل کرو۔ اگر تم میرے دشمنوں کے دوست رہو گے اور وہی کرتے رہو گے جو اب تک کرتے رہے تو میں بنگال اور ہر جگہ جہاں تمہارا پرچم لہراتا ہے لکھوں گا کہ اسے سرنگوں کر دیا جائے اور تمہاری کوٹھیاں تباہ کر دی جائیں[۱۲۵]" اس کے جواب میں ڈوپلے نے محمد علی خاں کو جس کا ایک خط اسی مضمون کا آیا تھا کہ تم کو ناصر جنگ کا ساتھ دینا چاہیے لکھا کہ تم نے مظفر جنگ کے خلاف جنگ کی ہے اگر تم ان کے شریک ہو جاؤ تو ہمارے دوست ہو سکتے ہو۔ نواب ناصر جنگ کو فقط یہ لکھ دیا گیا کہ آپ کے خط کا جواب محمد علی خاں کو دیا گیا ہے۔

انگریزوں نے اپنے لئے ایک زرین موقع دیکھا لہذا محمد علی خاں کے ذریعہ دربار ناصری میں عروج پانے کی کوشش کرنے لگے چنانچہ ۱۲ر دسمبر ۱۷۴۹ء کے لگ بھگ ناصر جنگ نے قلعہ داؤد ولی (Saint David) کے گورنر کو خلعت بھیجا جس کا بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا گیا۔ ترچناپلی میں انگریزی جھنڈا لہرایا گیا، بہت سا گولا بارود بھیجا گیا اور قلعہ داؤد ولی میں نذرانہ اور تحفے بھیجنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ادھر نواب ناصر جنگ بڑھتے رہے اور ۱۳ر دسمبر ۱۷۴۹ء سے پہلے راجگڑہ پہنچ گئے۔ ڈوپلے اس زمانہ میں بہت پریشان تھا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ بہت جلد اس کی جگہ کسی دوسرے گورنر کا تقرر ہونے والا ہے۔ اس کی گئی جاگیریں تھیں اور مختلف لوگوں کے پاس

---

[۱۲۵] روزنامچہ ڈوپلے، جلد ششم، ۷ر دسمبر ۱۷۴۹ء

اس کا روپیہ قرض کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور اس کی جگہ کوئی گورنر سے تک نہیں آیا۔

۲۲ر جنوری کو ڈوپلے نے چندا صاحب کو خط لکھا کہ مظفر جنگ چونکہ لڑانے کے لئے جانا چاہتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ نواب ناصر جنگ کی فوج کے کئی بڑے سردار ان کے دوست ہیں لہٰذا ان سے کہو کہ اپنے اہل و عیال کو پانڈیچری بھیجدیں یہاں وہ حفاظت سے رہیں گے۔ درحقیقت جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا یہ ڈوپلے کی عیاری اور پیش بینی تھی کہ اگر نواب مظفر جنگ گرفتار ہو جائیں یا نواب ناصر جنگ سے مل جائیں تو یہ لوگ میرے پاس بطور یرغمال رہیں چنانچہ یہی ہوا اور نواب ناصر جنگ کو ان کی وجہ سے بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ نوجوان اور ناتجربہ کار مظفر جنگ نے خیال کرکے بیوی بچے اور ماں کو پانڈیچری بھیجدیا۔ گورنر کے ایما سے چندا صاحب اور فرانسیسی افسر ایم ڈی۔ آٹول [illegible] نے تنجور پر حملہ کیا راجہ بہت پریشان ہوا اور اس نے وعدہ کیا کہ بہت جلد ان کا مطالبہ پورا کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نواب ناصر جنگ اور انگریزوں سے مدد مانگی۔ مظفر جنگ، چندا صاحب اور فرانسیسی افسر انتظار کرنے لگے ڈوپلے چاہتا تھا کہ فوراً ترچناپلی پر حملہ کر دیا جائے لہٰذا اس نے چندا صاحب کو لکھا کہ روپیہ جلد وصول کرلو اور ترچناپلی پر حملہ کردو لیکن راجہ حیلے بہانے سے ٹالتا رہا۔ بالآخر چندا صاحب نے حملہ کرکے راجہ کو شکست دی۔ میلیسن اس فتح کا سہرا فرانسیسی افسر کے سر باندھتا اور چندا صاحب پر غفلت اور لاپروائی کا الزام لگاتا ہے بہرحال راجہ کو شکست ہوئی لیکن قلعہ پر اب بھی قبضہ نہ ہوا کیونکہ راجہ نے مقابلہ کرکے قلعہ کے پھاٹک سے مار بھگایا۔ انگریزوں

ﷺ روزنامچہ پلے۔ جلد ہشتم۔ ۱۳ر مارچ ۱۷۵۰ء

نے راجہ کو اطلاع دی کہ نواب ناصر جنگ ایک عظیم الشان فوج لے کر دشمنوں کی سرکوبی کے لئے آرہے ہیں۔ اب ڈوپلے اور بھی پریشان ہوا کیونکہ ادھر نواب ناصر جنگ کی آمد آمد تھی اور ادھر مرہٹوں کا خوف جن سے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے تنجور پر حملہ کیا گیا تھا۔ ڈوپلے نے چندا صاحب کو لکھا کہ جس طرح ہو سکے تنجور پر قبضہ کر لیا جائے لیکن نواب ناصر جنگ کے آنے کی خبر پہنچ چکی تھی۔ چندا صاحب اور فرانسیسی فوجیں اس قدر پریشان ہوئیں کہ لشکر میں غدر پھیل گیا۔ مظفر جنگ اور چندا صاحب کی بے تنخواہ چالیس ہزار فوج نے تنخواہ کا مطالبہ شروع کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نواب ناصر جنگ کی فوج میں تین لاکھ سپاہی تھے جن میں سے تربیت یافتہ چالیس ہزار سے زائد نہ تھے۔ ان میں مرہٹی راؤ کے دس ہزار، محمد علی کے چھ ہزار اور میجر لارنس کے چھ سو یورپین بھی شریک ہو گئے۔ متحدین یعنی مظفر جنگ، چندا صاحب اور فرانسیسی سخت پریشان تھے۔ فوج میں انتشار اور بےچینی پھیلی ہوئی تھی۔ ڈوپلے نے فوج کو تنخواہ دے کر آرام کرنا چاہا۔ مجموعی فوج پانڈیچری سے شمالی مغربی سمت میں چل کر ایک مناسب مقام پر مقیم ہوئی۔ سامنے ہی والداور میں غنیم کی فوج فروکش تھی۔ ڈوپلے نے اس وقت بھی اپنی عیاریوں سے کام لینا چاہا تاکہ نواب ناصر جنگ کسی طرح پلٹ جائیں۔ ادھر نواب ناصر جنگ برابر آگے بڑھتے رہے۔ مرہٹوں نے الگ فرانسیسی لشکر پر چھاپے مارنے شروع کئے جس سے بڑی ابتری پھیل گئی۔ امن وامان مفقود ہو گئے اور تمام کرناٹک میں لوٹ مار ہونے لگی۔ ۴ مارچ ۱۷۵۰ء کو مرہٹوں نے فرانسیسی فوج کو بھاداگڑی کے پاس گھیر لیا لیکن ایک خونریز جنگ کے بعد فرانسیسی بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ چندا صاحب نے پانڈیچری پہنچ کر کہا کہ نواب ناصر جنگ کی خبر پاکر ہم تنجور سے واپس آرہے تھے راستہ میں مرہٹوں نے حملہ کیا ہم انھیں پسپا کر کے یہاں

واپس آ گئے۔ اس کے بعد اس نے مشورہ دیا کہ ہمیں اس وقت نواب ناصر جنگ سے مقابلہ نہ کرنا چاہیے۔ دو ماہ بعد وہ خود حیدرآباد واپس جائیں گے، اس وقت ہم بآسانی صوبہ پر قبضہ کرلیں گے لیکن ڈوپلے نے اتفاق نہ کرکے مشورہ دیا کہ آگے بڑھ کر نواب ناصر جنگ سے مقابلہ کرو اور فتح کی صورت میں اورنگ آباد تک بڑھتے چلے جاؤ۔ اس نے یہ بھی کہا کہ نواب ناصر جنگ کی فوج میں دو شخص رام داس پنڈت اور مورو پنڈت ہیں، ان پر نواب ناصر جنگ کو بہت اعتماد ہے لیکن یہ مظفر جنگ سے بہت کچھ امیدیں رکھتے اور ان کے ہوا خواہ ہیں، انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ نواب ناصر جنگ کی فوج کو بھڑکا کر ہمارے موافق کردیں گے۔ ڈوپلے نے کہا ان لوگوں سے یقیناً مدد لے کر فائدہ اٹھانا چاہیے۔[۵۶]

ڈوپلے نے نواب ناصر جنگ سے پھر پیغام و سلام کا سلسلہ شروع کیا وہ چاہتا تھا کہ انھیں دھوکہ میں رکھ کر اپنی تیاریاں مکمل کرکے سازش کا ایک وسیع جال بچھا دے۔ نواب ناصر جنگ کو اس کی اطلاع مل گئی، انھوں نے قلعہ نصرت گڈھ جنجی کے قلعہ دار کو پروانہ بھیجا کہ فوراً قلعہ میرے بھیجے ہوئے قلعہ دار کے سپرد کردو، چنانچہ ۱۸ مارچ کو حسب الحکم پرانے قلعہ دار نے عمل کیا۔ مورو پنڈت اور سید لشکر خاں سپہ سالار نواب ناصر جنگ کے خطوں سے جو انھوں نے ڈوپلے کو لکھے تھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں چندا صاحب کو ارکاٹ دینے کے حامی تھے۔

صلح کی کوشش | مارچ سنہ ۱۷۵۰ء کے آخر میں نواب ناصر جنگ نے اپنے بخشی محمد انور خاں بہادر کو نواب مظفر جنگ بہادر کے پاس بھیجا تاکہ ان کو اپنے ساتھ منا کرلے جائیں۔ ڈوپلے نے یہ سن کر

---

۵۶ روزنامچہ پلے جلد ہشتم: ۱۳ مارچ سنہ ۱۷۵۰ء

بہت پیچ وتاب کھایا۔ اسے نواب مظفر جنگ پر شبہ تھا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے اس نے مسلمان سرداروں کو بہت برا بھلا کہا جس کی تائید خوشامدی اور چاپلوس رنگاپلے نے ہاں میں ہاں ملا کر کی۔ دوسرے روز مظفر جنگ کا خط آیا جس میں ملاقات کی تفصیل تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے بسنت کے سامنے محمد انور خاں سے گفتگو کی میرے خیال میں صلح دونوں کے لئے بہتر ہے ورنہ مجھے یقین ہے کہ تمہاری مدد سے فتح ہو گی۔ اس کے بعد چندا صاحب کا خط ملا جس میں ملاقات کی تفصیل تھی کہ نواب ناصر جنگ لڑنا نہیں چاہتے کیونکہ مظفر جنگ کو بیٹے کے برابر سمجھتے اور ان کو اور چندا صاحب کو جاگیریں دینے کو تیار ہیں۔ وہ اس قرض کو بھی ادا کر دیں گے جو مظفر جنگ نے فرانسیسیوں سے لیا ہے۔ اس جواب میں نواب ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ نے کہا کہ "ادونی اور دوسرے علاقے مجھے دیئے جائیں۔ چندا صاحب کا ارکاٹ دیا جائے اور قرضے ادا کر دیئے جائیں۔ لیکن بغیر فرانسیسی گورنر کی مرضی و مشورے کے میں کچھ نہیں کر سکتا" یہ معلوم کر کے ڈوپلے نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اس نے مظفر جنگ اور چندا صاحب کو کہا کہ شرائط اچھے ہیں میرے ذریعہ صلح کرو۔ خط روانہ کرنے کے بعد ایم۔ ڈی۔ اتول کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ نواب ناصر جنگ کی شرط یہ ہے کہ مظفر جنگ، چندا صاحب کا ساتھ چھوڑ دیں لیکن مظفر جنگ نے جواب دیا کہ میں چندا صاحب اور فرانسیسیوں کو نہیں چھوڑ سکتا

ڈوپلے نے اندازہ رنگاپلے سے کہا کہ تنجور کے معاملہ میں چندا صاحب کو پچاس لاکھ روپیہ ملیں گے۔ ان میں مظفر جنگ کو دیئے ہوئے چالیس لاکھ روپیہ میں سے ۲۸ لاکھ مجھے ملنے چاہئیں۔ مگر یہ ڈوپلے کی بے ایمانی تھی۔ رنگاپلے کی ڈائری کا مرتب ڈاڈویل کہتا ہے کہ "فرانسیسیوں نے مظفر جنگ کو صرف تین لاکھ روپیہ قرض دیا تھا۔ ایم۔ کلچرو کے بیان کے مطابق بہت عرصہ یہ بھی یہ رقم سات لاکھ روپیہ سے کسی طرح زیادہ نہ تھی (روزنامچہ پلے ۹ دسمبر ۱۷۴۹ء)

جنگ اور فتح ناصری | معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد صلح کی گفتگو منقطع ہوگئی۔ ڈوپلے کو اب بھی مظفر جنگ پر شبہہ تھا کہ وہ نواب ناصر جنگ سے سازش کر رہے ہیں۔ نواب ناصر جنگ کی فوجیں آگے بڑھیں۔ اپریل کے پہلے ہفتہ ایم۔ ڈی اتول فرانیسی سپہ سالار نے ڈوپلے کو اطلاع دی کہ "پچاس فرانسیسی افسر اس لئے لڑنے سے انکار کر رہے ہیں کہ غنیم بہت طاقتور ہے۔ مظفر جنگ اور چنداصاحب کے خط میں تحریر تھا "چند افسر اور سپاہی جنگ کے خلاف ہیں کیونکہ غنیم بہت طاقتور ہے اور اس کے پاس بہت زبردست توپ خانہ ہے فوج تیار بھی ہوگئی تھی لیکن افسروں نے جنگ سے انکار کردیا"[۵]

آخر کار ۳ اپریل کو بمقام کبلا اتر جنگ ہوئی۔ دونوں جانب کے توپ خانوں نے آتش باری کی ناصر جنگ کو غلبہ ہوا۔ فرانسیسیوں نے سراسیمہ و پریشان ہوکر بھاگنا شروع کیا۔ ایم۔ ڈی۔ اتول حواس باختہ ہوگیا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس شکست کی ذلت سے خود کو کس طرح بچائے۔ صاحب ماثر الامرا کا بیان ہے کہ "۲۶ ربیع الآخر ۱۱۶۳ھ تو تاسہ پاس کامل آتش خانہ فرنگ سرگرم اشتعال بود" نواب ناصر جنگ نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ ان کا مہاوت مارا گیا اور ہودے میں آکر ایک گولی لگی۔ لیکن وہ برابر لڑتے رہے۔ آخر کار سپاہیوں کو فرانسیسیوں کو ایسی شکست فاش ہوئی کہ ان کے پاؤں میدان کارزار سے اکھڑ گئے۔ اب اتول کو خوف تھا کہ نواب ناصر جنگ آگے بڑھ کر پانڈیچری پر حملہ کریں گے اس نے کوشش کی کہ ایک مرتبہ اور قسمت آزمائی کرے لیکن ایسی شکست فاش ہوئی تھی کہ کسی کو ہمت نہ پڑی۔ خوشامد، دھمکیاں اور وعدے کچھ کام نہ آئے۔ یہ دیکھ کر اس نے بھاگنے کو موت پر ترجیح دی۔ چنداصاحب اور نواب مظفر جنگ کو چھوڑ کر پانڈیچری کی

---

[۵] روزنامچہ۔ پلے:۔ جلد ہفتم یکم اپریل ۱۷۵۰ء

طرف بھاگا جس سے یہ دونوں سخت پریشان ہوئے چندا صاحب فرانسیسیوں کا پرانا نمک خوار تھا اس لیے اس نے اب بھی فرانسیسیوں کا دامن نہ چھوڑا۔ رضی دانش نے کیا خوب کہا ہے ؎

نمک شناس اسیران چو از قفس ستند ۔ بہ نخل خانۂ صیاد آشیاں بستند

اس نے مظفر جنگ کو بھی ساتھ لے جانا چاہا۔ لیکن انھوں نے بھاگنے کو ذلت سمجھ کر جانے سے قطعاً انکار کر دیا اور اپنے ماموں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ چندا صاحب نے بیوفا اور ابن الوقت فرانسیسیوں کے پیچھے ہی رہنا پسند کیا بقول ملیسن اس کا خیال تھا کہ دشمن سے حسب ضرورت مقابلہ کرکے فرانیسی فوجوں کے لئے سپر بنے[۱۹]۔ یہ لوگ اس پریشانی اور سراسیمگی کے عالم میں بھاگے کہ ان چالیس توپچیوں کو اطلاع بھی نہ دے سکے جو پڑاؤ کے سامنے مقابلہ کے لئے کھڑے تھے۔

مراری راؤ کی بہادری | صبح کو افواج ناصری کو فرانسیسیوں کے بھاگنے کی خبر ملی۔ مراری راؤ نے دس ہزار مرہٹوں کے ساتھ تعاقب میں روانہ ہو کر پانڈیچری کے قریب ان بھگوڑوں کو جالیا۔ آتول نے اپنی فوج کو ایک مربع کی شکل میں ترتیب دیا اور چندا صاحب بھی حملہ کرنے کو تیار ہو گیا۔ بہادر مرہٹہ سردار روز گذشتہ کی فتح کے نشہ سے سرشار تھا۔ چنانچہ اس نے بڑے جوش و خروش سے ان بھگوڑوں پر حملہ کیا لیکن وہ اور اس کے پندرہ آدمی گھر گئے۔ آفریں ہے اس کی بہادری اور جرأت پر کہ غنیم کی صفوں کو توڑ کر نکل آیا اس حملہ میں کئی سپوت اور بہادر مرہٹے کام آئے۔ اس نے بڑھ بڑھ کر متواتر حملے کرکے فرانیسی فوج کا ناطقہ تنگ کر دیا جس نے بھاگ کر ایک جھاڑی کے پیچھے محفوظ مقام

---

[۱۹] میلیسن۔ ہندوستان میں فرانسیسیوں کی تاریخ

پر پناہ لی۔ اس جھڑپ میں متعدد فرانسیسی تلوار کے گھاٹ اترے۔

مغربی اقوام اپنی شکست کو فتح اور بھاگنے کو رجعت یا پسپائی کہتی ہیں چنانچہ میلین نے بھی اس فرار کو رجعت سے تعبیر کیا ہے مشرقی اقوام کو فتح بھی حاصل ہوتی ہے تو اسے شکست سے تعبیر کیا جاتا ہے مغربی قومیں غلط سلط اسباب بتا کر اپنی فوقیت اور برتری کا اظہار کرتی ہیں شکست کی یادگاریں اس طرح قائم کی جاتی ہیں گویا خود ان کو فتح اور فاتح کو شکست ہوئی چنانچہ یہی ڈوپلے نے کیا۔ اس کو بہت صدمہ ہوا ہزاروں منصوبے دیکھتے ہی دیکھتے خاک میں مل گئے لیکن اس نے نواب ناصر جنگ کو اس قسم کے خطوط لکھے گویا اسی کی فتح ہوئی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک خط میں لکھا کہ "انورالدین خاں کے خاندان سے کسی فرد کو کرناٹک کا نواب نہ بنایا جائے اور نواب مظفر جنگ کے بیٹوں کو اعلیٰ عہدے دیئے جائیں"۵۰ مرازہی راؤ کی فتح کو شکست سے تعبیر کیا اور اس کے ساتھ ہی سازشوں میں مصروف رہا اور نواب مظفر جنگ کے ہوی بچے جس مکان میں مقیم تھے اس پر پہرا اٹھا دیا۔ وہ نواب مظفر جنگ پر بہت ناراض تھا چنانچہ اس نے بجا ئے آتول اور دیگر افسروں کو سرزنش کرنے کے ان کو مورد الزام قرار دیا اور چندا صاحب کے سمجھانے پر بھی یہ خیال دل سے نہ نکالا کہ نواب مظفر جنگ نے دھوکا دیا ہے۔ اس سے ڈوپلے کی فطرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چونکہ وہ خود سازشی اور مکار تھا لہٰذا ہر شخص کے متعلق ایسا ہی خیال کرتا تھا۔

فرانسیسیوں کی اس شکست فاش اور نواب مظفر جنگ کی نظر بندی کے بعد نواب ناصر جنگ پورے دکن کے بلا شرکت غیرے مالک تھے انھوں نے اپنے اہل

۵۰۔ میلین:۔ ہندوستان میں فرانسیسیوں کی تاریخ

دربار سے مشورہ کیا جنھوں نے کہا کہ نواب مظفر جنگ ہی باعث فتنہ ہیں لہذا اور ا ز میان باید برداشت" لیکن نواب ناصر جنگ نے اسے قطعاً پسند نہ کیا۔ جملہ ہندوستانی مورخ متفق ہیں کہ نواب ناصر جنگ کو نواب مظفر جنگ سے بیحد محبت تھی لیکن حاجی فاضل دارو غہ نواب مظفر جنگ کی زبانی پہلے لکھتا ہے کہ نواب ناصر جنگ کو اس خوف سے نہیں قتل کیا کہ شہنشاہ نے ان کے نام صوبہ داری کا پروانہ بھیجا تھا جو نواب ناصر جنگ نے ان تک پہنچنے نہیں دیا۔ مگر حقیقتاً حاجی فاضل کا یہ بیان صحت پر مبنی نہیں کیونکہ بادشاہ دہلی نے اس پروانہ کو نواب ناصر جنگ کے حق میں منسوخ کر دیا تھا۔

چندا صاحب کے مشورے اور بار بار کہنے سے آخر کار نواب ناصر جنگ کو ڈوپلے نے ایک خط لکھا جس کا مطلب یہ تھا "میں نے آپ کو لکھا تھا کہ میں صلح چاہتا ہوں لیکن آپ کے پاس سے کوئی جواب نہ آیا۔ جنگ یا صلح جو آپ پسند کریں میں اس کے لئے تیار ہوں اگرچہ خبر رساں چپراسی میرے سامنے کھڑے ہونے کے لائق نہ تھے لیکن آپ کا احترام کر کے میں نے خود ان سے گفتگو کی۔ انھوں نے آپ کی طرف سے خط میں تاخیر ہونے پر عذر کیا اور یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ جلد جواب لائیں گے لیکن اب تک نہیں آئے لہذا میں نے فوج روانہ کر دی ہے۔ اب میں نواب مظفر جنگ یا چندا صاحب کے لئے نہیں لڑ رہا ہوں بلکہ میں اور آپ دشمن ہیں۔ آپ تیار رہیئے"۔ اس قسم کا دھمکی آمیز خط ڈوپلے نے لکھا مگر درحقیقت یہ ایک چال تھی اور اپنی شکست کو چھپاتے اور نواب ناصر جنگ کو مرعوب کرنے کا بہانہ تھا۔ اسی زمانہ میں قلعہ داود ولی سے میجر لارنس کا خط آیا جس نے لکھا تھا کہ اگر تم چاہو تو میں نواب ناصر جنگ سے تمھاری صلح کرا دوں۔ گورنر کے پوچھنے پر رنگا پلے نے کہا کہ کسی انگریز کے بجائے حال کے ذریعہ مصالحت کرنی

بہتر ہے[۱]۔ ڈوپلے نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ اگر ہم انگریزوں کے ذریعہ صلح کریں تو یورپ میں بڑی سبکی ہوگی۔ اب ڈوپلے وہ خادم اور جاں نثار ڈوپلے نہیں رہا تھا جو نواب آصفجاہ بہادر کے عہد حکومت میں یا نواب ناصر جنگ کے ابتدائی عہد میں تھا اب اس کو برابری کا دعویٰ تھا چنانچہ شاہنواز خاں کو لکھتا ہے کہ "میں فقط دو بادشاہوں کو جانتا ہوں احمد شاہ پادشاہ اور شاہ فرانس۔ میں جانتا ہوں کہ نواب ناصر جنگ اس علاقہ میں بادشاہ کے نائب ہیں میں بھی اسی جگہ نائب بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کرتا ہوں اور ہمارے رتبہ سے دونوں بادشاہ واقف ہیں۔ نواب ناصر جنگ کے ایما سے شاہنواز خاں نے نواب مظفر جنگ کے اہل و عیال کو طلب کیا تھا لیکن ڈوپلے نے انھیں بھیجنے سے صاف انکار کر دیا۔

صلح کی گفتگو اور سازش | اس عرصہ میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ نواب ناصر جنگ چاہتے تھے کہ نواب مظفر جنگ کو ارکاٹ کا صوبہ دار بنا کر چلے جائیں۔ ڈوپلے کی کوششوں اور دربار ناصری کے سفرشیون کی مدد سے آخر کار نواب ناصر جنگ سے ۸ اپریل ۱۷۵۰ء کو ڈوپلے سے ایسے لوگ طلب کئے جو معاملات پر گفتگو کرنے کے لائق ہوں۔ ڈوپلے نے بسئے اور ڈی لاٹشے کو بھیجا۔ اس کے ساتھ سا ترجمان کرکے سید لشکر خاں اور ایک چار ہزاری امیر کو بھی خط لکھے کہ میں آپ کے ذریعہ صلح کرنا چاہتا تھا لیکن نواب ناصر جنگ نے لکھا ہے کہ شاہنواز خاں کے ذریعہ گفتگو کی جائے اس لئے مجبور ہوں۔ یہ لوگ نواب ناصر جنگ کے پڑاؤ پر پہنچے گفتگو ہونے پر نواب ناصر جنگ نے کہا کہ نواب مظفر جنگ کو جاگیر دی جائے گی اور چندا صاحب کو نواب تو نہ بنایا جائے گا ہاں اگر شورش نہ کرنے کا وعدہ کریں

---

[۱] روزنامچہ انندا رنگا پلے جلد ہفتم: ۱۲- اپریل ۱۷۵۰ء

تو جاگیر دی جائے گی تو ہتھیار واپس نہ ملیں گی۔ سفارت ناکام ہوئی اور یہ لوگ واپس آئے اُن کے پاس شاہنواز خاں کا ایک خط تھا کہ بسّی اور لارنس قابل آدمی ہیں۔ تم کو ان سے سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ احتیاط سے کام لو اور سوچ سمجھ کر کام کرو۔ شاہنواز اور رامداس پنڈت نے ڈوپلے کو مشورہ دیا تھا کہ نواب ناصر جنگ کی فوج پر پے در پے شبخون مار کر پریشان کر دو تو وہ صلح پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ۲۰ اپریل کو لارنس نے ولیانالور ندی کے کنارے نواب ناصر جنگ کی فوج پر شب میں چھاپا مارا اور کچھ لوگوں کو قتل کر کے بھاگ آیا۔ جس پر رامداس نے تعریف لکھی۔ چونکہ مراری راؤ اور رام چندر دلدر راجہ چندر سین عالمگیری بھاگ گئے تھے لہذا نواب ناصر جنگ نے سرزنش کی جس پر یہ لوگ ناراض ہو گئے۔ سازشیوں نے اور بھڑکایا چنانچہ اب یہ بھی دشمن ہو گئے اور ڈوپلے سے خط و کتابت ہونے لگی جس کو مراری راؤ نے لکھا تھا کہ میں اپنے بیوی بچے تمہاری حفاظت میں بھیجنے والا ہوں۔ اس زمانے میں بھی صلح کی گفت و شنید ہوتی رہی۔ خود نواب مظفر جنگ نے اپنے بیوی بچوں کو طلب کیا لیکن ڈوپلے نے کہلا بھیجا کہ وہ خود نہیں آنا چاہتے۔ سازشیں رنگ لا رہی تھیں چنانچہ محمد علی اور لشکر خاں سے سر بازار جھڑپ ہوئی پھر میر اسد اور لشکر خاں میں جھگڑا ہوا جس میں سازشیوں نے نواب ناصر جنگ کو میر اسد کے خلاف بھڑکایا۔ نواب ناصر جنگ کو بعد میں خط ملا جو دراصل ڈوپلے نے لکھوایا تھا تو بڑی تکلیف ہوئی اور انھوں نے بہت رنج اور غصہ ظاہر کیا اور کہا کہ اگر پہلے ایسا معلوم ہوتا تو میں دو کروڑ روپیہ فضول نہ خرچ کرتا اور اورنگ آباد سے تین سو میل کے فاصلہ پر نہ آتا۔ یہ صوبہ نواب مظفر جنگ کو دے کر دہلی چلا جاتا یہی نہیں بلکہ نواب مظفر جنگ کو اورنگ آباد اور حیدرآباد میں اپنا نائب مقرر کرتا مگر حالات اس کے بالکل خلاف

ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے روانگی کا فیصلہ کیا۔

مئی سنہ ۱۷۵۰ء کے ابتدائی ہفتے میں مسٹر کوپ اور میجر لارنس سے سارم میں حاضر ہو کر عرضداشت پیش کی کہ انھوں نے بڑی خدمتیں انجام دی ہیں لہٰذا پوناملی، میلاپور اور دیونام پٹن بطور انعام دیئے جائیں۔" نواب ناصر جنگ نے یہ درخواست پھاڑ کر پھینک دی اور غصہ میں کہا "تم نے کیا خدمت کی ہے فرانسیسیوں نے نہ صرف نواب مظفر جنگ کی ہر طرح مدد کی بلکہ میرے خلاف بجائے ان کو دھوکہ دینے کے بہادری سے مقابلہ کیا۔ فرانسیسی بہادر ہیں لیکن تم لوگ نمک حرام ہو۔" یہ کہہ کر ان کو چلے جانے کا حکم دیا۔ انھوں نے پھر حاضر ہونے کی کوشش کی تو چوبداروں نے گردنیاں دے کر نکال باہر کیا۔ سازشی درباریوں نے فوج میں بد دلی پیدا کر دی اور فرانسیسیوں کی طرف سے نواب ناصر جنگ کو خوف دلانا شروع کیا۔ ان کے لشکر کی جملہ خبریں ہر روز پانڈیچری پہنچتی رہتی تھیں اور یہ لوگ مشورے دیتے تھے کہ نواب ناصر جنگ کے خلاف کس طرح کارروائیاں عمل میں لائی جائیں۔ سازش کا جال اتنا وسیع تھا کہ اس میں ہمت خاں، سید لشکر خاں، قاضی دائم، مورو پنڈت، رامداس پنڈت، سانوجی نمبالکر، مراری راؤ، راجہ رام چندر، سید شریف خاں، سید جمیل خاں، عبدالنبی خاں، حمایت بہادر خاں اور عبدالمجید خاں وغیرہ سب پھنس گئے تھے لیکن سب سے زیادہ خطرناک نمک حرام رامداس پنڈت تھا۔ وہ خود کو نواب ناصر جنگ کا وفادار اور نواب مظفر جنگ کا دشمن ظاہر کرتا۔ اس طرح ان کے خیالات معلوم کر کے سید لشکر خاں اور مورو پنڈت سے بیان کرتا جو ڈوپلے تک پہنچاتے تھے جن کے مشورے سے نواب مظفر جنگ کو چھڑانے کی

سازش کی گئی لیکن صبح ہو جانے کی وجہ سے بھاگ گئے میں ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد نواب ناصر جنگ کو گرفتار کر کے قید کرنے کی سازش ہوئی لیکن اس میں بھی سازشی ناکام رہے ڈوپلے اپنا کام کرتا رہا۔ کسی سے اس نے جاگیر کے وعدے کئے اور کسی کو زر نقد پانے کی امید دلائی اور اس طرح نواب ناصر جنگ کے خلاف ایک پورا بارود خانہ تیار کر لیا جس کو فقط ایک چنگاری کی ضرورت تھی۔

دکن کی عام حالت | اس زمانہ میں نواب ناصر جنگ سخت پریشان تھے۔ ملک میں قحط تھا! اناج بہت گراں تھا، لکڑی ملتی نہ تھی، مویشیوں میں مرض بری طرح پھوٹ پڑا تھا۔ شمال میں مرہٹوں نے تاخت و تاراج کر کے اندھیر مچا رکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی متواتر خبریں آ رہی تھیں کہ منصور علی خاں وزیر شہنشاہ دہلی مخالفت پر آمادہ ہے۔ شیر جنگ کو صوبہ دار دکن بنا کر بھیجا گیا ہے جس نے برہان پور پر قبضہ کر لیا ہے۔ نواب ناصر جنگ بہادر کی صوبہ داری منسوخ ہو گئی ہے اور تمام قلعہ داروں اور حکام دکن کے نام فرمان شہنشاہی صادر ہو چکا ہے کہ نواب ناصر جنگ کے خلاف شیر جنگ کی مدد کریں[۲۳] ان حالات میں یہ سازشیں ان کے لئے بہت ہی پریشان کن ثابت ہوئیں۔ محمد علی کو کرناٹک کا صوبہ دار بنایا، ان کی فوجوں نے پھلی چرم اور نیاوں کی فرانسیسی کوٹھیوں پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا جس سے ڈوپلے بہت پریشان ہوا۔ اس عرصہ میں نواب ناصر جنگ کرناٹک روانہ ہوئے۔ محمد علی اور فرانسیسیوں میں کئی چھوٹی چھوٹی جنگیں ہوئیں۔

ڈوپلے کو اس کی کامیابی پر داد دینا چاہئے کہ اس کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے تیروو تی کی جنگ میں محمد علی کے پندرہ ہزار سپاہیوں میں سے ایک نے بھی فرانسیسیوں

کے خلاف ہاتھ نہ اٹھایا ادھر محمد علی کو انگریزوں پر اعتماد تھا اور اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی جماعت بھی کمپنی بہادر کے سپاہیوں کی تھی لیکن یہ لوگ فضول اور ایک قسم کا بار تھے محمد علی نے بمقام باہور فرانسیسی فوج کو شکست دی لیکن اس فتح میں کمپنی کے سپاہیوں کا کچھ حصہ نہ تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے بڑی ذلیل حرکت کی اور محمد علی کو مخت دھوکا دیا۔ سپٹے اپنی ڈایری ۹ اگست ۱۷۵۱ء میں لکھتا ہے کہ سٹرکوپ ہزار پگوڈے یومیہ کے وعدے پر محمد علی کے ساتھ آیا تھا۔ چوتھے روز پانچ ہزار پگوڈے دیے گئے اور انگریز افسر نے باوجود اپنے وعدوں کے روپیہ حاصل کرتے ہی دھوکا دیا اور اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مسٹرکوپ نے محمد علی سے کہا کہ قلعہ داؤد دلی میں بیناگور نر اور ہا ہی میجر لارنس کچھ نہیں کر سکتا اور میری واپسی کا حکم آگیا ہے۔

اس زمانہ میں بھی سازشی محمد علی خاں کے خلاف نواب ناصر جنگ کو بھڑکاتے رہے جس سے وہ آخر کار خفا ہو گئے۔ شاہنواز خاں نے میرا سد پر پانڈیچری سے سازش کا الزام لگایا جس نے کہا کہ میں غدار اور نمک حرام نہیں اس کے بعد نواب ناصر جنگ نے محمد علی خاں کو طلب کیا۔

نواب ناصر جنگ ارکاٹ میں مقیم تھے خبر پہنچی کہ فرانسیسیوں نے نہایت تیاری سے قلعہ نصرت گڑھ جنجی پر قبضہ کر لیا ہے۔ بارش بہت زور و شور سے ہو رہی تھی۔ تمام کرناٹک میں طوفان برپا تھا۔ راستہ دشوار گذار تھے۔ ندی نالے امنڈ آئے تھے۔ لشکر تک مشکل تمام رسد پہنچتی تھی لکڑی کا قحط تھا لیکن اس حالت میں بھی نواب ناصر جنگ نے فرانسیسیوں کی سرکوبی کا فیصلہ کیا اور ۱۱ر شوال ۱۱۶۳ھ کو ارکاٹ سے روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک بزرگ کے ایما سے تمام منہیات سے توبہ کی اور

یلغار کرتے ہوئے پانڈیچری کے قریب پہنچ گئے۔ علامہ غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ "سرداران افاغنہ کہ باآنکہ باوصف شمول عنایات و انواع رعایات و حقوق پرورش مطلقاً پاس نمک خوارگی ولی نعمت نداشتند۔ بہ طمع ملک و مال باطناً با فرنگیاں بدیں متفق و یکدل شدند۔ و جواسیس خود فرستادہ فرنگیاں را کہ زیر قلعہ چنجی اجتماع داشتند بقصد شبخون طلبیدند"[22]

شبخون | ۱ محرم ۱۱۶۴ھ کی شب میں فرانسیسیوں نے اچانک حملہ کیا۔ اگر افغان نواب ان کی مدد نہ کرتے تو ان کی مجال نہ تھی کہ افواج ناصری سے مقابلہ کر سکتے۔ لوگوں نے نواب ناصر جنگ سے کہا بھی کہ یہ نواب نمک حرام اور غدار ہیں لیکن نواب ناصر جنگ "از کمال صفائی طینت اعتبار نہ کرد کہ من با اینہا چہ بد کردہ ام"۔ پو پھٹنے کے قریب نواب ناصر جنگ بہادر اپنا ہاتھی بڑھا کر افغانوں کی طرف گئے کہ ان کو جنگ کرنے کے لیے ہمت دلا کر آگے بڑھائیں۔ جیسے ہی ان کا ہاتھی ہمت خاں کے ہاتھی کے قریب پہنچا، نواب ناصر جنگ نے خود سلام کیا۔ جواب نہ ملا تو خیال کیا کہ شاید اندھیرے میں پہچانا نہیں اس لئے حوضے (ہودے) سے سر بلند کیا اور نمک حرام اور بے ہمت ہمت خاں نے مع اپنے دوسرے ساتھی کے جو اس کے ساتھ ہودے میں تھا، گولیاں چلائیں جو نواب ناصر جنگ کے سینے میں لگیں اور ان کی روح فوراً قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

فوج بے سردار رہ گئی تھی اب کیا ٹھہر سکتی، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ

۲۲؎ ماثر الامرا، جلد سوم

نمک حراموں کا غلبہ ہو فرانسیسی کامیاب ہوئے۔ شہید کے جسم کو چند وفادار اورنگ آباد لے گئے۔ لیکن نمک حراموں کو بھی چین سے رہنا نصیب نہ ہوا۔ اسی مقام یعنی لکریت پلی میں ۷ ربیع الاول کو دوبارہ جنگ ہوئی جس میں بڑے بڑے افغان سردار مارے گئے۔ اسی تاریخ نواب ناصر جنگ شہید کی تدفین شاہ برہان الدین غریب کے روضہ میں عمل میں آئی جس کے دوسرے دن یعنی ۸ ربیع الاول کو افغان سردار اسی جنگل میں جہاں وہ کھیت رہے تھے دفن ہوئے فاعتبروا یا اولی الابصار۔

علامہ غلام علی آزاد نواب ناصر جنگ شہید کے استاد تھے۔ ہمیشہ سفر و حضر میں ساتھ رہتا تھا۔ انھوں نے تاریخ وفات "آفتاب رفت" ۱۱۶۴ سے اور حافظ اسعد کی نے "تم نہ شہید واللہ لعن قاتلہ" سے نکالی۔

نواب شہید کو شعر و شاعری سے بہت ذوق تھا چنانچہ تین دیوان یادگار رہیں۔ انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر ان کی علمی اور ادبی زندگی پر نظر ڈالی جائے گی۔

محمد عبدالوہاب مسلم

ملاحظہ: مدفن او میدان سرزمین لکریت پلی بفاصلہ یک فرسخ از موضع راسے جوتی و یک فرسخ از درہ کماکالوہ کہ درہ الیست مشہور در نواحی کرنپہ"

سرو آزاد صفحہ ۱۹۰ میں ہے ان کی نعش لے جاکر اورنگ آباد میں دفن کی گئی۔

اعظم الامرا نواب اسطوجاہ

اعظم الامرا کے کارناموں کی وقعت ہمارے دلوں میں اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ اس طوفان خیز سمندر کا تذکرہ نہ کیا جائے جس سے انھیں حیدرآباد کی سیاسی کشتی کو پار لگانا تھا۔ اٹھارویں صدی تاریخ ہند اور خصوصاً تاریخ دکن میں اپنے سیاسی تغیرات کے باعث بہت اہمیت رکھتی ہے۔ مغل شہنشاہیت کے جس عالیشان قصر کو بابر اور اکبر نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا تھا، اس کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی چلی جارہی تھیں اور آسمان سے باتیں کرنے والے کنگرے یکے بعد دیگرے گرتے چلے جارہے تھے اور اس کے "ریختہ" سے مختلف چھوٹے چھوٹے قصر تعمیر ہورہے تھے۔ ان ہی تعمیروں میں ایک غیر ملکی قوت نے حصہ لے کر پرانی بنیادوں پر ایک نیا عالیشان قصر تعمیر کیا۔ اس کی بنیاد کلائیو کے ہاتھوں پڑی۔ اور ڈلہوزی نے انیسویں صدی میں اس کے بلند ترین کنگرے تعمیر کئے۔ ہندوستانیوں کے نفاق اور رشک و حسد نے کس قدر اینٹ اور چونا مہیا کیا اس کی تفصیل ایک دردناک داستان ہے جسے ان کے بعد آنے والی نسلیں بھلا نہیں سکتیں۔

اٹھارویں صدی اپنے حالات اور واقعات کے اعتبار سے حد درجہ سیاسی انتشار اور بے چینی کی صدی ہے۔ ہندوستانی سلطنتیں اپنے نفاق کی بدولت ایک دوسرے کے خلاف غیر ملکی قوتوں سے مدد مانگ کر فرانسیسیوں اور انگریزوں کو مضبوط بنا کر اپنی سیاسی آزادی کھو رہی تھیں۔ حیدرآباد میں حضرت مغفرت مآب کے انتقال اور

ناصر جنگ شہید کی بے وقت موت نے حیدرآباد کی زرخیز سلطنت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ دکن کے وسط میں ہونے کی وجہ سے اس کا محل وقوع بہت خطرناک تھا۔ اس سلطنت کے دشمنوں کو اس پر چاروں طرف سے حملہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ دنیا کا دستور ہے کہ ہر نئی چیز کی طرف پہلے پہل بدگمانی اور مشتبہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہی حال سلطنت حیدرآباد کا تھا جو چاروں طرف خطرناک دشمنوں سے گھری ہوئی تھی مشرق کی طرف غیر ملکی اقوام اسے ہضم کرنا چاہتی تھیں اور شمال میں مرہٹے منڈلاتے رہتے تھے جن سے اپنے ابتدائی دور میں آصف جاہ اول نے اپنی سلطنت کو ان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے جس تدبر اور دانشمندی سے بچایا وہ صفحات تاریخ پر یادگار رہے گا۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد پھر حیدرآباد پر سیاسی انتشار کے بادل منڈلانے لگے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ نواب ناصر جنگ کی بے وقت موت کی وجہ سے حیدرآباد کی مشکلوں میں اور اضافہ ہوا۔ اس سیاسی انتشار کے زمانہ میں نواب صلابت جنگ اس کشتی کے ناخدا بنائے گئے انھوں نے فرانسیسی جنرل بسی کی مدد سے تخت حاصل کیا تھا، اس لئے وہ خود کو فرانسیسیوں کے زیر اقتدار سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ اپنی کلانیت کی وجہ سے تاج و تخت کے مالک بنائے گئے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی سلطنت میں برابر کے شریک ہو گئے اور اپنے مصارف کے لئے شمالی سرکار جیسے زرخیز علاقہ جات ہضم کر گئے۔ انھیں حالات نے صلابت جنگ کے تیرہ سالہ عہد حکومت کو تاریخ دکن کا تاریک عہد بنا دیا۔ اگر خوش قسمتی سے اس وقت آصفجاہ ثانی کا قیمتی مشورہ اور تائید شامل حال نہ ہوتی تو خدانخواستہ حیدرآباد کو برا دن دیکھنا نصیب ہوتا جنھوں نے اپنی دانشمندی سے مرہٹوں کی مدافعت کی اور فرانسیسیوں کا

زور توڑا۔ لیکن نواب صلابت جنگ کے کمزور عہد حکومت کا خمیازہ مدت تک حیدرآباد کو بھگتنا پڑا۔ قدم قدم پر حکومت کو مالی مشکلات پیش آتی تھیں۔ اندرونی نظم و نسق کا شیرازہ بکھرا دیکھ کر بیرونی دشمن حیدرآباد کے سیاسی امن و امان کو خطرہ میں ڈال رہے تھے جنوب میں میسور کی سلطنت اپنے بانی نواب حیدر علی خاں اور ان کے بیٹے ٹیپو سلطان کے عہد حکومت میں طاقتور ہو کر حیدرآباد کی رقیب بنی ہوئی تھی۔ انگریزوں کو بھی اس سے غیر معمولی خوف تھا۔ لیکن انھوں نے کبھی تنہا اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کی۔

ڈوپلے کے چلے جانے کے بعد فرانسیسیوں کا اثر رفتہ رفتہ دکن کی سیاست سے کم ہوتا چلا گیا اور ان کی جگہ انگریزوں نے لی۔ لیکن سب سے زیادہ ڈر حیدرآباد کو جس قوت سے تھا وہ شمال میں مرہٹوں کی ریاست تھی۔ گو ۱۷۶۱ء کی جنگ پانی پت نے مرہٹوں کی قوت توڑ دی تھی اور اس شرمناک شکست کے صدمہ کو بالاجی راؤ برداشت نہ کر کے فوت ہو گیا تھا لیکن چوتھے پیشوا مادھو راؤ نے مرہٹوں کی ترقی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس پر نانا فرنویس جیسے مرہٹہ مدبر اور سیاس نے جس کو مرہٹہ میکیاولی کہا جاتا ہے۔ حالات کا مطالعہ کر کے مرہٹوں کی منتشر قوتوں کو بڑی خوبی سے یک جا کر دیا۔

دکن کے سیاسی سمندر میں یہی طوفان تھا جس سے حیدرآباد کی کشتی کو کامیابی سے پار لگانا اعظم الامراء ارسطو جاہ کا بہترین کارنامہ ہے جس کو دکن کی آنے والی نسلیں کسی حال میں بھی بھلا نہیں سکتیں۔

نام | ان کا تاریخی نام غلام سید ہے۔ بدقسمتی سے ان کے خاندان اور بچپن کے

تفصیلی حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ البتہ تمام مورخوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کے آبا و اجداد ایران کے ساسانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس زمانہ میں حضرت آصفجاہ اول دہلی میں مقیم تھے غلام سید خاں کے والد فرخ نژاد خاں آصفجاہ اول کے ملازم تھے۔ غالباً انھیں کے ساتھ حیدرآباد آئے اور غفران مآب نے انھیں برار کا صوبہ دار بنا دیا۔ جہاں ان کا انتقال ہوا۔ وفات کے وقت غلام سید خاں حضرت نواب نظام علی خاں بہادر کی ملازمت میں تھے اور واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ہمیشہ حضرت غفران مآب کے ہمرکاب رہتے اور حیدر جنگ کے قتل کے واقعہ میں جو بسی کے مختار تھے غفران مآب کے شریک حال تھے۔ دراصل یہیں سے ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اس کے بعد محالات صوبہ برار کے دیوان اور اورنگ آباد کے صوبہ دار بنا دیئے گئے۔ معین الدولہ سہراب جنگ ان کو خطاب ملا تھا۔ غفران مآب ان کی سیاسی قابلیت کا پتہ چلا کر اکثر سفارتی کام ان کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔ ان خدمات کو انھوں نے نہایت قابلیت سے انجام دے کر اپنے تئیں موزوں ثابت کر دکھایا۔ ان سفارتی کاموں میں زیادہ مشہور راؤ پنڈت پردہان اور رگھوجی بھونسلہ کا فیصلہ ہے۔ اول الذکر تصفیہ کے لئے انھیں پونا اور موخر الذکر کے لئے ناگپور جانا پڑا انھوں نے ان مفوضہ خدمات کو نہایت خوش اسلوبی اور قابلیت سے انجام کو پہنچایا اور نمایاں کام کئے۔ چونکہ ان میں اعلیٰ کام کرنے کی صلاحیت تھی، اور نظم و نسق کی طرف رجحان تھا۔ اس لئے انھوں نے برار سے حیدرآباد تبادلہ کی کوشش کی تاکہ مرکزی حکومت میں حصہ لے۔ جب ۱۷۷۵ء میں حیدرآباد کے مدار المہام رکن الدولہ خاں کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ چند روز وقار الامراء نے کام کیا جو غلام سید خاں کے سرپرست تھے

اسی دوران میں ظفرالدولہ کی ترقی شروع ہوئی جو بہت جلد حیدرآباد کے مدارالمہام بنائے گئے لیکن ظفرالدولہ مبارزالملک کا صدرالمہام بنایا جانا غلام سید خاں کے لئے مفید ثابت نہ ہوا۔ چونکہ ان کے اور ظفرالدولہ کے تعلقات ایک عرصہ سے کشیدہ تھے اور ان سے کسی قسم کی مدد کی توقع رکھنا فضول تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو حکومت میں عروج پیدا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ان کو صرف وقارالدولہ سے ہمدردی کی توقع تھی۔ چنانچہ وقارالدولہ نے بھی حضرت غفران مآب سے ان کے متعلق سفارش کی تھی کہ غلام سید خاں مرکزی حکومت میں کام کرنے کے قابل ہیں۔ اس لئے یہاں کوئی کام ان کے سپرد کردیا جائے۔ خود غفران مآب بھی غلام سید خاں سے خوب واقف تھے۔ لہذا غلام سید خاں کو مرکزی حکومت میں لینا پسند فرمایا۔ اور حیدرآباد بلا کر پیشکاری کی خدمت سپرد کی۔ مگر مبارزالملک کو ناگوار گذرا وہ غفران مآب سے اجازت لے کر نرمل چلے گئے اور وہاں جاکر یہ عرضداشت بھیجی کہ جب تک معین الدولہ سہراب جنگ حیدرآباد میں رہیں گے وہ صدرالمہامی کی خدمت انجام دینے پر راضی نہ ہوں گے ان کی درخواست پر مبارزالملک کے پاس خاطر سے غلام سید خاں اودسہ بھیج دیئے گئے۔ تو مبارزالملک حیدرآباد واپس ہوئے۔

ایسا شخص جس کی فطرت میں عالی حوصلگی اور بلند خیالی بھری ہو نچنت نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اودسہ کے گرد و پیش سے خود ان کے والد اور ان کو ایک عرصہ کی حکمرانی نے مانوس کردیا تھا لیکن قلعہ اودسہ میں بند رہنا گویا اپنی قابلیت کا گلا گھونٹنا تھا انھوں نے وقارالدولہ کی زندگی تک ان سے کام نکالنے کی کوشش کی اور مرکزی حکومت میں تبادلہ کے متعلق متعدد خطوط ان کے نام لکھے مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا

کہ وقار الدولہ کا انتقال ہوگیا۔ اب مجبوراً انھیں خاموشی اختیار کرنی پڑی لیکن ان کی بلند پرواز طبیعت نے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ دیکھا کہ خود مبارز الملک سے مل کر اپنے تعلقات صاف کریں اور انھیں کے ذریعہ اپنی ترقی کی کوشش کریں۔ پہلے مبارز الملک کو انھوں نے ایک مخلصانہ خط لکھ کر موافقت کا اظہار کیا پھر اعلیٰ حضرت سے اجازت لے کر خود نرمل گئے اور ان سے ملاقات کی۔ واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ ایسے شیریں زبان تھے کہ ان کی گفتگو دوست و دشمن ہر دو کے دلوں کو موہ لیتی تھی چنانچہ انھوں نے اپنی خوش کلامی سے مبارز الملک کو اس قدر گرویدہ بنا لیا کہ انھوں نے اپنی دیرینہ مخالفت کو نہ صرف بھلا دیا بلکہ اسی قلم سے جس سے انھوں نے یہ تحریر کیا تھا کہ "جب تک معین الدولہ سہراب جنگ اوسہ نہ بھیج دیئے جائیں میں مدار المہامی کی خدمت انجام نہیں دے سکتا" اب یہ تحریر نکلتی ہے کہ "غلام سید خاں کے بغیر میں کام نہیں کر سکتا۔ بلکہ مجھے دلجمعی نصیب نہیں ہو سکتی"۔ یہ سفارش موثر تو ثابت ہوتی مگر اس کے عملی جامہ پہنانے میں شمس الدولہ کی ذات نے روڑے اٹکائے۔ غلام سید خاں حیدرآباد بلائے گئے۔ مگر یہاں آنے کے بعد ان کو شمس الامرا سے تشویش تھی لیکن انھوں نے اپنے خاص طریقہ عمل، انداز بیان اور خوش معاملگی سے انھیں بھی اپنے موافق بنا لیا ان کے سیاسی ہتھکنڈوں کو جن سے وہ مبارز الملک اور شمس الامرا کے رام کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مورخ ان کی دنیاداری اور سیاسی داؤ پیچ کی طرف منسوب کر کے ان کے اخلاق پر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن اس نکتہ چینی اور ملامت کے باوجود ان کی سیاسی اور انتظامی قابلیت میں کوئی کلام نہیں۔ ان کی وہ سیاسی چالیں جو مبارز الملک اور شمس الامرا کے خلاف چلی گئیں ان کی قابلیت پر دلالت کرتی ہیں۔

نزل سے آنے کے بعد دو مرحلے ان کے پیش نظر تھے اول تو شمس الامرا کو رام کرنا اور اپنی انتظامی قابلیت کا اظہار کر کے سرکار کو اپنی طرف متوجہ کرنا۔ موخر الذکر مرحلے کو طے کرنے کے لیے کفایت شعاری کا اصول نہایت کارگر ثابت ہوا۔ اس لیے کہ بدنظمی کے باعث سلطنت کا مالیہ خسارہ میں تھا۔ انھوں نے مختلف طریقوں سے حکومت کی آمدنی میں اضافہ کیا جس سے اعلیٰ حضرت پر بہت اچھا اثر پڑا اور انھوں نے غلام سید خاں کو مشیر الملک کا خطاب دے کر انتظامی کام ان کے سپرد کیا پہلے یہ مددگار دیوان بنائے گئے تاکہ دیوان کے ساتھ کام کر کے مزید تجربہ حاصل کر سکیں۔ رفتہ رفتہ ان کی ہمہ گیر قابلیت تمام امور سلطنت پر حاوی ہوگئی اور تمام مالی و ملکی امور میں دخیل ہو کر عملاً مدارالمہامی کرتے تھے۔ ظفر الدولہ مبارز الملک کا انتقال ہوا تو ابوالفتح خاں شمس الملک کے مشورہ سے ۱۸۰۱ء میں ان کو مدارالمہامی کا خلعت دیا گیا، ساتھ ہی بحالی و برطرفی کے جملہ اختیارات ملے، اعظم الامرا کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب ملا۔ ۱۸۰۱ء میں آصف جاہ ثانی نرمل سے جگتیال کے قلعہ دار ظفر الماس حبشی کو مغلوب کر کے حیدرآباد واپس ہوئے دفتر پیشکاری اور دیوانی بھی جو راجہ دیانت دنت سے متعلق تھے ان سے متعلق کر دیے گئے۔[۱]

قلمدان وزارت ان کے حوالہ ہونے کے بعد سب سے زیادہ اہم اور ضروری معاملہ جنگ میسور رہے۔ مرہٹے ہمیشہ نواب حیدر علی خاں سے برسر پیکار رہتے تھے۔ جن کی ترقی انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ انھوں نے اس قوت کا تنہا مقابلہ کرنا مصلحت کے خلاف سمجھ کر حضور نظام کی تائید چاہی اور ۱۸۷۱ء میں بالاجی راؤ پیشوا اور پنڈت پردھان نے حضرت غفران مآب سے اودگیر میں ملاقات کی اور یہ طے ہوا کہ متحدہ طور

---

[۱] ماہنامہ رہبر دکن ۱۳۴۳ف

پر میسور پر حملہ کردیں۔ جب حیدرآباد کی فوجیں میسور پر بڑھیں تو مرہٹوں نے وعدہ کے مطابق مدد نہ کی اور حیدرآباد کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑا اس لئے کہ بیجاپور کے مسئلہ میں دونوں سلطنتوں میں ناچاقی پیدا ہوگئی تھی۔ آصفجاہ ثانی اس مہم سے دل برداشتہ ہوکر حیدرآباد واپس ہوگئے۔ لیکن واپسی کے بعد معلوم ہوا کہ حیدرعلی نے قلعہ امتیاز گڑھ کا محاصرہ کرلیا ہے۔ غفران مآب نے ٹیپو سلطان پر حملہ کرنا چاہا لیکن شمس الملک اور اعظم الامرا نے یہ مہم اپنے ہاتھ میں لی اور بندگان عالی کو بذات خود جانے سے روکا۔ حیدرآباد کی یہ فوج آنے سے ٹیپو سلطان نے محاصرہ اٹھا لیا اور اس طرح داراجاہ کے بیوی بچے سلامتی سے اس تعلقہ سے نکالے گئے۔ آصف جاہ ثانی ناموس آصفیہ کی اس حفاظت سے بہت خوش ہوئے اور جب ادھونی سے فوج واپس ہوئی تو جشن عیدالضحٰی میں شمس الملک اور اعظم الامرا کو زمرد کے طرہ اور موتیوں کے آویزے عطا ہوئے۔

میسور کی تیسری جنگ دراصل کمپنی کے حرص و آز کا نتیجہ ہے۔ اس نوخیز سلطنت سے انگریزوں کو بہت ڈر تھا اور وہ اس کے خاتمہ کے درپے تھے۔ کیونکہ اس کی موجودگی ہندوستان میں انگریزی منصوبہ کی تکمیل میں زبردست رکاوٹ تھی۔ اس جنگ میں حیدرآباد کو قوت بڑھانے کے لئے شریک کیا گیا۔ کمپنی کی جو فوجیں جنرل میڈوز کے تحت آئیں ان میں حیدرآباد اور مرہٹوں کی فوجیں بھی شریک ہوگئیں۔ موقع کی نزاکت دیکھ کر خود کارنوالس کو فوج کی قیادت اپنے ہاتھ لینی پڑی۔ آصف جاہ ثانی کی فوج کی رہنمائی شہزادہ سکندرجاہ اور اعظم الامرا کے سپرد کردی گئی لیکن عملی طور پر تمام نقل و حرکت اعظم الامرا کے ایما سے ہوتی تھی۔ یہی انگریز افسر سے

ملتے تھے اور جنگ کے نقشہ تیار کرتے تھے ۱۷۹۹ء میں سرنگاپٹم پر دھاوا بولا گیا تو اعظم الامرا اور رہبری پنڈت کی کوششوں نے فوجی تنظیم میں روح پھونک کر میسور کی زبردست سلطنت کو نیچا دکھایا۔ میسور کی فتح کے بعد مال غنیمت اور علاقہ کی تقسیم میں حیدرآباد کو ایک تہائی حصہ ملا۔ و۔ دریائے تنگ بھدرا کے شمال کا حصہ جو پہلے حیدرآباد کے ہاتھ سے نکل گیا تھا دوبارہ حاصل ہوا۔

جنگ کھرڈلہ اس جنگ کے بعد ان کے اس مشہور کارنامہ کے واقعات شروع ہوتے ہیں جن کی بدولت انھیں صفحات تاریخ پر بقائے دوام حاصل ہوئی یعنی جنگ کھرڈلہ جو کہ تاریخ دکن میں مشہور جنگ ہے اس جنگ کے اسباب دیرینہ تھے مرہٹے ایک عرصہ سے حیدرآباد سے چوتھ اور سردیس مکھی کے مدعی تھے۔ حیدرآباد ان مطالبات کو ناجائز خیال کرتا تھا۔ میسور کی تیسری جنگ کے اختتام پر کارنوالس نے یہ کوشش کی تھی کہ تینوں فریقین یعنی انگریز، مرہٹہ اور حیدرآباد میں ایک عہدنامہ ہو جو آپس میں ایک دوسرے کی حفاظت کی کفالت کرے۔ کارنوالس کی یہ تدبیر بہت مفید تھی لیکن اس میں مرہٹہ اپنا نقصان سمجھتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اس اتحاد میں شرکت سے احتراز کیا۔ مگر اعظم الامرا اور آصف جاہ ثانی نے مرہٹوں کے اس انکار کے بعد کوشش کی کہ کم از کم کمپنی اور حیدرآباد کے درمیان اس قسم کا عہدنامہ ہو جائے لیکن ان کی یہ کوششیں بارور نہیں ہوسکیں۔ اس لئے کہ ۱۷۹۳ء میں کارنوالس انگلستان واپس ہوا اور اس کی جگہ سرجان شور گورنر جنرل بن کر آیا جس نے اصول علیحدگی کی کوشش پر نظر رکھ کر اس کو نظرانداز کردیا۔ مرہٹوں کے مطالبات روز بروز بڑھنے لگے اور بالآخر پونا سے گوبند راؤ کالے

کو ایلچی بنا کر حیدرآباد بھیجا اور دو کروڑ ساٹھ لاکھ روپیوں کا مطالبہ کیا۔ اول تو یہ مطالبہ ناجائز تھا۔ دوسرے جس شخص کو ان مطالبات کے لئے بھیجا گیا تھا وہ دربار دکن کی سفارت کے ناقابل تھا چنانچہ اثنائے گفتگو میں اعظم الامرائے کہا کہ اس معاملے کے فیصلہ کے لئے خود نانا فرنویس کو آنا چاہئے ایلچی نے نانا فرنویس کی مصروفیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ کیسے آسکتے ہیں۔ اعظم الامرائے کہا کہ "وہ کیسے آسکتے ہیں؟ میں ابھی بتاتا ہوں کہ وہ حضور میں کشاں کشاں کیسے چلے آتے ہیں"[1] ان الفاظ سے حکومت پونا بہت بھڑکی اور جنگ کے لئے آمادہ ہوگئی۔ اور اگرچہ آخر وقت تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن دونوں حکومتوں نے جنگ کی تیاری شروع کردی۔

آصف جاہ ثانی اور اعظم الامرا نانا فرنویس کے رقیب مادھوجی سندھیا کو اپنا طرفدار بنانے کی کوشش کر رہے تھے مگر اس کی موت نے حیدرآباد کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کی موت سے دلیر ہو کر ۱۷۹۴ء میں نانا فرنویس نے اپنی افواج کا اجتماع شروع کردیا۔ پیشوا مادھوراؤ نانا فرنویس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا۔ سندھیا کی موت نے اس کی طاقت میں اور اضافہ کردیا۔ نانا فرنویس اس بات کو بھول گیا تھا کہ بیس سال پہلے رگھوبا کو تخت سے اُتارنے میں حیدرآباد نے اس کی کس قدر مدد کی تھی کمپنی نے اپنے پچھلے معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر حیدرآباد کا ساتھ دینے سے انکار کیا گو ۱۷۶۶ء اور ۱۷۹۲ء کے معاہدوں کی رو سے کمپنی کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ حیدرآباد کا ساتھ دے۔

متعدد مرہٹہ رئیس اور سردار اپنا لشکر لے کر نانا فرنویس کے جھنڈے تلے جمع ہوئے

---

[1] تاریخ مرہٹہ، گرانٹ ڈف

تھے، پیشوا کے علاوہ دولت راؤ سندھیا، رگھوجی بھونسلہ، تکاجی ہولکر اور گوبند راؤ گائیکواڑ بھی شریک تھے۔ اور اس طرح سے مرہٹہ فوج کی جملہ تعداد تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار سوار ہوئی تھی اور لوٹ مار کے لالچ سے دس ہزار پنڈارے بھی شریک تھے اور فوج کے بعض حصوں کی کمان جنرل پیران جیسے فرانسیسی افسروں کے ہاتھوں میں تھی۔ حیدرآباد کی فوج میں یہ تنظیم نہ تھی۔ اور خود اعظم الامرا جو اس وقت سیاست حیدرآباد کے روح رواں تھے اپنے جوان اور اکلوتے لڑکے کی موت سے حواس باختہ اور پریشان تھے[۱]

اس صدمہ سے ان کے ہوش وحواس درست نہ تھے اور بعض وقت حیدرآباد کی سڑکوں پر نکل جایا کرتے، غفران مآب نے اپنے چھوٹے بیٹے جہانگیر علی خان سلیمان جاہ کو ان کے آغوش میں دے دیا تاکہ ان کو اطمینان قلب نصیب ہو۔ اس عزت افزائی سے ان کے حواس بجا ہوئے اور وہ جنگ مرہٹہ کے لئے تیار ہو سکے باغ گوردھن داس میں فوج جمع کی گئی اور حضرت غفران مآب اس فوج کا معائنہ کر کے بیدر پہنچے۔ جہاں مادھوجی سندھیا کے انتقال کی خبر پہنچی جس سے اعظم الامرا اور غفران مآب کو بہت تشویش ہوئی اور انھوں نے اس کے جانشین دولت راؤ سندھیا کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کی۔ لیکن نانا فرنویس کی ریشہ دوانیوں نے[۲] انھیں ناکام رکھا اور دولت راؤ سندھیا کو بہت سی امیدیں دلا کر اپنا شریک بنا لیا اور پرسرام بھاؤ کو سپہ سالار مقرر کیا۔

۱۳ شعبان ۱۲۰۹ھ کو کھرڈلہ کے قریب جنگ شروع ہوئی۔ جنگ کا آغاز

---

[۱] تاریخ مرہٹہ گرانٹ ڈف صفحہ (۱۱۲)

[۲] گلزار آصفیہ صفحہ (۱۵۹)

حیدرآباد کے موافق معلوم ہو رہا تھا۔ مرہٹہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے لیکن اعظم الامرا کی مخالف جماعت کی بیوفائی نے کام خراب کیا جس نے وقت پر کمک نہ پہنچائی اور میدان جنگ سے ہٹ کر مرہٹوں سے مل گئی۔ اکثر جاں نثاران دولت آصفیہ میدان جنگ میں کام آئے جن میں ظفر الملک اور منصور الدولہ بہت ممتاز ہیں۔ جانبازوں نے مرہٹوں کو بار بار شکست دے کر پرچم آصفی کی حفاظت کی۔ ان جانباز امرا کا خاتمہ ہوا تو مرہٹوں نے یلغار شروع کی اور رات کی تاریکی میں حیدرآباد کی فوج تتر بتر ہو گئی اس لئے حضرت غفران مآب نے حفاظت کی خاطر میدان جنگ سے ہٹ کر قلعہ کھرلہ[1] میں پناہ لی۔ یہ ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جو تین طرف پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ چوتھی جانب مرہٹوں نے قبضہ کر کے رسد رسانی میں بڑی دقتیں پیدا کیں۔ یہاں بھی گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پنڈارے الگ لوٹ مار مچا رہے تھے اور رات کی تاریکی میں حیدرآباد کی فوج پریشان تھی۔ آخر کار صلح کی گفت و شنید شروع ہوئی اور ۱۹ ار رمضان کو عہدنامہ مرتب ہوا جو حیدرآباد کے لئے بہت ذلت آمیز تھا۔ اس عہدنامہ کی رو سے اول تو اعظم الامرا کو مرہٹوں کے حوالہ کرنا پڑا۔ کیونکہ انھوں نے نانا فرنویس کی اہانت کی تھی۔ اس کے بعد دولت آباد کا قلعہ اور دریائے تاپتی سے قلعہ پرینڈہ تک کا سارا علاقہ پونا کے سپرد کر دیا گیا۔ مع ان اضلاع کے جو ۱۷۶۰ء میں سدا شیو راؤ بھاؤ نے فتح کئے تھے اور جنھیں نظام الملک نے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا اور تین کروڑ روپیہ معاہدہ میں طے ہوئے۔ ایک کروڑ تو اسی وقت نقد دینا پڑا اور بقیہ کے متعلق یہ طے ہوا کہ ۳۵ لاکھ سالانہ کی قسط ادا کی جائے گی۔ مرہٹوں نے رقم

---

[1] تاریخ مرہٹہ از گرانٹ ڈف۔

کی ادائیگی کے لئے اعظم الامرا کی شخصی ضمانت طلب کی۔ کیونکہ اس شرط سے مرہٹے اعظم الامرا کو قید کر کے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ غفران مآب کو دلی صدمہ ہوا۔ اور وہ دوبارہ مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن "آن نمک خوار خیر خواہ خیر اندیش بہ ممانعت پیش آمدہ عرض کردہ کہ ملال خاطر نصیب اعدا باشد۔ غلام در عرصہ یک دو روز تصفیہ ایشان کردہ حاضر دربار میشود ہرگز قصد دیگر نہ باید فرمود.......... و خود بدولت و اقبال با چشم گریاں اعظم الامرا را روانہ لشکر راؤ پنڈت پردھان فرمودند"۔ ان شرائط صلح کے بعد ۱۲ رمضان کو غفران مآب حیدرآباد واپس ہوئے اور راجہ شام راج کو اعظم الامرا کی نیابت میں مدار المہامی کا کام سپرد کر دیا۔ آئندہ مصیبتوں سے اپنے ملک و مالک کو بچانے کی خاطر خود کو مرہٹوں کے حوالہ کرنا اعظم الامرا کی قربانی اور ایثار کی بین دلیل ہے اگر وہ اپنی جان اور عزت کی پرواہ کرتے تو شاید حیدرآباد کو اس سے برا دن دیکھنا نصیب ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اعظم الامرا جیسے جلیل القدر وزیر کا مرہٹوں کے حوالہ کر دینا حیدرآباد اور فرماں روائے حیدرآباد کے لئے ایک دردناک واقعہ تھا لیکن جنگ کھرڈلہ کی مصیبتوں سے بچاؤ کی کوئی اور تدبیر نہ تھی۔ اور ان کا پونا میں قید ہونا خود حیدرآباد کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں انھوں نے وہاں کے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھا کر حیدرآباد کے نقصان کی تلافی کی۔

جس وقت اعظم الامرا مرہٹہ کیمپ میں پہنچے ہیں تو مرہٹوں پران کا اور ان کے رئیس کا اتنا رعب تھا کہ خود نانا فرنویس نے پانچ ہزار سواروں کے ساتھ تین کوس آگے آکر ان کا ایسا استقبال کیا کہ گویا اس کے معزز مہمان نہیں بلکہ رئیس تھے۔ اور جب پیشوا مادھو راؤ کے خیمہ میں گئے تو وہ اٹھ کر ان کی تعظیم بجا لایا اور اپنے برابر بٹھایا

ا۔ گلزار آصفیہ صفحہ ۱۶۰

پونا میں ان کو ایک پرانے باغ میں ٹھیرایا گیا تھا جیسی ان کی عزت کی جاتی تھی ویسی ہی ان کی حفاظت بھی کی جاتی تھی۔ اور ان کی نگرانی کے لئے ایک ہزار فرنگی جوان اور ایک ہزار عرب متعین تھے۔ ان کی تنہائی کا خیال کر کے آصفجاہ ثانی نے ان کا پورا اسٹاف ان کے ساتھ کر دیا تھا۔ لیکن ان کے سوا کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی اور ملنے والوں کی کافی تلاشی لی جاتی تا کہ کسی قسم کا کاغذ اندر داخل نہ ہونے دیں۔

اعظم الامرا کو اس قید سے بڑی روحانی تکلیف ہوئی اور کم و بیش تین سال نظربند رہے۔ ان کو رنج تھا کہ کھرڈلہ کی شرمناک شکست انھیں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ جلد اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے اور رات دن دعا مانگتے تھے کہ خدا انھیں اس نقصان کی تلافی کا موقع عطا فرمائے یہ دعا آخر کار پوری ہوئی۔

ایک روز یہ مصروف مناجات تھے کہ ایک ہرکارہ نے آکر اطلاع دی کہ نانا فرنویس کی جکڑبندیوں سے تنگ آکر پیشوا مادھو راؤ نے خود کو بالاخانے پر سے گرا کر جان دیدی۔ اعظم الامرا کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی اور ساتھ ہی خوشی بھی کیونکہ ان کی رہائی کا دارومدار دربار پونا میں کسی اہم سیاسی تغیر پر منحصر تھا۔ نانا فرنویس بہت پریشان ہوا تخت پونا کے حقیقی وارث نانا فرنویس کے متوفی رقیب و دشمن رگھوبا کے تین لڑکے باجی راؤ، جنا، اور امرت راؤ تھے جن میں سے باجی راؤ اور جنا تو ایک ماں کے بطن سے تھے اور امرت راؤ دوسری ماں کے بطن سے۔ واقعاً یہی اصل وارث تھے۔ اور نوجوان متوفی پیشوا مادھو راؤ ایک زرگر کا لڑکا تھا۔ نانا فرنویس نے اپنے اقتدار کو دربار پونا پر قائم رکھنے کے لئے یہ چال چلی تھی کہ نارائن راؤ کی حاملہ بیوی کے

۱؎ گلزار آصفیہ صفحہ ۱۶۲

ہاں جب لڑکی پیدا ہوئی تو اس معصوم لڑکی کا گلا گھونٹ کر ایک سنار کے بچے کو جو اسی روز پیدا ہوا تھا۔ نرائن راؤ کا بیٹا مشہور کیا اور اس طرح پیشوا مادھو راؤ کے نام سے تخت پونا پر بٹھایا اور تینوں بھائیوں کو قلعہ پونا میں قید کرکے اپنے ایک معتمد بلونت راؤ کو دو ہزار سواروں کے ساتھ ان کی نگرانی کے لئے مقرر کیا۔ مادھو راؤ کے انتقال کے بعد نانا فرنویس نے کوشش کی کہ مادھو راؤ کی بیوہ کسی کو متبنٰی بنالے اور اس کے اختیارات قائم رہیں یا امرت راؤ کو جو سب سے کمسن تھا۔ گدی نشین کرکے اپنے اختیارات قائم رکھے۔ لیکن بڑے بھائی باجی راؤ کے ہوتے ہوئے یہ چیز ناممکن تھی۔ اس لئے نانا فرنویس نے کوشش کی کہ کسی طرح باجی راؤ کا خاتمہ کردے۔ اعظم الامرا کو جب ان امور کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ایک رقعہ دولت راؤ سندھیا کے پاس بھیجا۔ اور اس طرح سندھیا کو نانا فرنویس کے منصوبوں سے مطلع کیا کہ "وہ امرت راؤ کو گدی نشین کرکے دربار پونا پر اپنا اقتدار جمانا چاہتا ہے۔ آپ اس کو ہرگز قبول نہ کیجئے۔ بلکہ باجی راؤ کی کلانیت کی وجہ سے اس کی گدی نشینی پر اڑے رہیئے۔ اور یہ امر خود دربار پونا اور مرہٹہ قوم کے لئے مفید ہوگا" دولت راؤ کو جب یہ اطلاع پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا اور اس رقعہ کا جواب فوراً روانہ کیا۔ اس عرصہ میں نانا فرنویس نے امرت راؤ کو گدی نشین کردیا تھا۔ لیکن بہت جلد عمائدین سلطنت میں اختلاف ہوا اور ذی اقتدار امرار دولت راؤ کے شریک ہوگئے نانا فرنویس نے مجبور ہو کر طوعاً و کرہاً باجی راؤ کی گدی نشینی پر رضامندی ظاہر کردی لیکن پرسرام بھاؤ سے مل کر فیصلہ کیا کہ جب رسم تہنیت کی ادائیگی کے لئے پیشوا باجی راؤ دیول بھوانی میں جائے تو دو ہزار بھونی اور پانچ ہزار عرب سوار تیار رہیں جو واپسی پر اس کے ساتھ قلعہ میں داخل ہوجائیں۔ ادھر پانچ ہزار عرب سوار مقابلہ کے لئے

تیار رکھیں۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آئے گا دیکھ لیا جائے گا۔ اس اثنا میں پرسرام کی آمد و رفت پیشوا کے خیمہ میں بڑھ گئی، باجی راؤ نے پرسرام کو اپنا مختار بنانے کا لالچ دیا جس نے پیشوا کو نانا فرنویس کے منصوبوں سے آگاہ کیا چنانچہ جس وقت اس رسم کی ادائیگی کے لئے نانا فرنویس نے باجی راؤ کو بلایا تو اس نے ناسازی مزاج کا بہانہ کر دیا جس سے نانا فرنویس کو بیحد تشویش ہوئی اور یقین ہو گیا کہ پرسرام نے باجی راؤ کو سارے منصوبوں سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب وہ پریشان ہو کر مشورہ کے لئے اعظم الامرا کے پاس روانہ ہوا حسن اتفاق سے اسی روز دولت راؤ سندھیا کا اسی باغ کے قریب سے گذر ہوا جس میں اعظم الامرا مقید تھے۔ دولت راؤ نے اعظم الامرا کے گھوڑوں کی بہت تعریف سنی تھی خصوصاً ان کے مرحوم فرزند سیف الملک عالی میاں کے گھوڑے کی جو ہنوز ان کے پاس موجود تھا۔ اس کے حاصل کرنے کے لئے اعظم الامرا سے ملا اور تھوڑی دیر بعد رخصت ہوا۔ نانا فرنویس کے کارکنوں نے اس کی خبر پہنچائی۔ جس سے اور پریشان ہوا اور جس وقت ان کے پاس آیا تو قسمیں دے کر دریافت کیا کہ سندھیا کا یہاں آنے سے کیا مقصد تھا۔

اعظم الامرا نے یقین دلایا کہ وہ صرف گھوڑوں کے لئے آیا تھا لیکن اسے یقین نہ آیا۔ آخر اعظم الامرا نے اس کی پریشانی سے فائدہ اٹھا کر کہا کہ "دولت راؤ تمھاری تاک میں ہے تم کو بے فکر نہ رہنا چاہیئے۔" نانا فرنویس نے گھبرا کر اعظم الامرا سے اپنے بچاؤ کی تدبیر دریافت کی اور کہا کہ دولت راؤ نے باجی راؤ کو گدی نشین کر کے اپنے اختیارات اس قدر بڑھا لئے ہیں کہ مجھے اس سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے اعظم الامرا نے دولت راؤ کے پنجہ سے رہائی حاصل کرنے کی تدبیر یہ بتائی کہ وہ

فوراً پونا سے فرار ہو کر قلعہ کوکن میں پناہ لے۔ اور انگریزوں سے گفت و شنید کر کے ان کو اپنی مدد پر آمادہ کرے نتائج کا انتظار کرے۔ نانا نے رضامندی ظاہر کی اور کہا کہ جناب بھی میرے ساتھ شریک رہیں۔ اس کے بعد راتوں رات نانا فرنویس نے پونا سے بھاگ کر قلعہ کوکن میں پناہ لی۔ اور اپنے ایک معتمد کو دو سو سواروں کے ساتھ پیچھے چھوڑ آیا کہ اعظم الامرا کو بھی قلعہ کوکن لائے۔ لیکن انھوں نے دولت راؤ سندھیا، پرسرام بھاؤ اور باجی راؤ کو مطلع کر دیا۔ اسی اثنا میں باجی راؤ اور پرسرام بھاؤ نے تبدیل آب و ہوا کے لئے پونا کے باہر خیمے ڈالے۔ تیس ہزار سوار مخفی طور سے پونا میں جمع کئے اور ساہوکاروں سے ایک کروڑ روپیہ حاصل کر کے موقع کے منتظر ہوئے۔ اس اثنا میں پرسرام بھاؤ اور باجی راؤ میں ناچاقی ہوئی، اور پرسرام نے امرت راؤ کو گدی نشین کرنے کی کوشش شروع کی۔ اعظم الامرا نے دولت راؤ اور باجی راؤ کو اس کی اطلاع دی ان دونوں نے خوش ہو کر کہا کہ تم اپنی فوج سے پرسرام بھاؤ کو گرفتار کرو لیکن انھوں نے جواب دیا کہ میں غریب الوطن قیدی ہوں فوج کہاں سے لاؤں۔ دولت راؤ نے حیدرآباد سے فوج منگانے کی درخواست کی۔ اس سے اعظم الامرا نے خوش ہو کر اپنا آدمی فوراً حیدرآباد روانہ کیا۔ آصفجاہ ثانی نے فوراً تین ہزار سوار اور آٹھ ہزار پیدل روانہ کئے اور اس کے بعد ہی تقریباً ساٹھ ہزار فوج اسی لاکھ روپیہ کے ساتھ اعظم الامرا کی خدمت میں روانہ کیا جس کے آنے سے اعظم الامرا کو ہمت ہوئی۔ اس فوج نے پرسرام بھاؤ اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے باجی راؤ کے پاس بھیج دیا جس سے سندھیا اور باجی راؤ بہت خوش ہوئے اور ان کی نظروں میں اعظم الامرا کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ اس کے بعد

اعظم الامرا پونا کے عمائدین میں شریک ہو گئے۔ سیاسی معاملات میں ان سے رائے لی جانے لگی۔ تھوڑے ہی دنوں میں عمائدین پونا میں ناچاقی پیدا ہو گئی جن کے بانی مبانی اعظم الامرا ثابت ہوئے اور پیشوا نے دولت راؤ سے اتفاق کر کے ان سے کہلا بھیجا کہ تمہارا تعلق، حضور بندگان عالی سے ہے جس شخص نے تمہیں حضور کی مرضی کے خلاف یہاں رکھا تھا اُسے اپنے اعمال کی سزا مل گئی۔ ہمیں حضور بندگان عالی کی جو درحقیقت ہمارے جد امجد ہیں ہر حال میں خوشنودی منظور و ملحوظ ہے۔ اور حضور کے خط برابر آپ کی طلبی کے لئے آ رہے ہیں۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضور کی آستان بوسی کا ارادہ کریں۔ کوئی شخص مانع نہ ہوگا ہم آپ کو بخوشی رخصت کرنے کے لئے تیار ہیں[1]۔ یہ اطلاع پاکر اعظم الامرا پونا سے رخصت ہو کر عازم حیدرآباد ہوئے۔ پیشوا نے قیمتی جواہر اور خلعت فاخرہ عطا کیا۔ راستہ میں نانا فرنویس کا وکیل یہ پیغام لے کر پہنچا کہ آپ مجھے قلعہ کوکن میں نامراد اور مقید چھوڑ کر اور اپنا مطلب حاصل کر کے حیدرآباد روانہ ہو گئے "مبارک ہو"، لیکن بزرگی و سرداری کا اقتضا یہ ہے کہ پیشوا سے میرا تصفیہ کرا دیں۔ یہ موقع احسان کرنے کا ہے۔ تغافل و چشم پوشی مناسب نہیں اس عنایت کے معاوضہ میں آپ ایک کروڑ روپیہ اپنے سفر خرچ اور تین کروڑ روپیہ کی دستاویز معہ سند معافی چوتھ صوبہ بیدر لے کر اور محالات و علاقہ دولت آباد (جو اب ہمارے علاقہ میں شامل ہیں) واگذاشت کر کے حیدرآباد تشریف لے جائیے تاکہ ناموری اور حضور کی خوشنودی کا باعث ہو[2]۔

اعظم الامرا نے خوش ہو کر باجی راؤ اور سرداران پونا کو خطوط لکھے اور خود پونا پہنچ کر نانا فرنویس سے تعلقات صاف کرانے کی کوشش کی۔ اور پیشوا و دیگر عمائدین پونا کو نانا فرنویس کی مدارالمہامی پر راضی کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے اسے بلا کر اپنے خیمہ میں ٹھیرایا

---

[1] گلزار آصفیہ صفحہ ۱۷۱ [2] گلزار آصفیہ صفحہ

باجی راؤ کے پاس لیجا کر ملازمت کا تصفیہ کرایا، اور دوسرے سرداروں سے بھی اس کی مصالحت کرادی۔ چنانچہ جب باجی راؤ کی مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی تو سب سے پہلے غفران مآب کی جانب سے قشقہ کی رسم اعظم الامرا نے انجام دی۔ نانا فرنویس نے عہد نامہ مہاڑ کے بموجب اپنے قول کے مطابق ایک کروڑ روپیہ نقد اور تین کروڑ روپیہ کی غفران مآب کی دستاویزیں مع سند معافی چوتھ بیدر دے کر اور محالات و قلعہ دولت آباد کو واگذاشت کر کے رخصت کیا۔ بندگان عالی ان کی واپسی سے بہت خوش ہوئے اور ان سے ملنے کے لئے موضع تہنیت نگر عرف لالہ گوڑہ سے قلعہ محمد نگر (گولکنڈہ) آئے۔ اعظم الامرا نے قدمبوسی کی بلدہ حیدرآباد آنے کے بعد پونا کی تمام نذریں اور اسناد پیش کیں۔ ان کی اس کامیابی سے جس نے جنگ کھرلہ کی بے عزتی کا داغ مٹا دیا تھا۔ آصفجاہ ثانی اور اہل ملک بیحد خوش ہوئے اور ان کو سلطنت کے سب سے بڑے خطابات ارسطو جاہ۔ فرزند ارجمند وکیل مطلق، مختار دولت آصفیہ ملے۔ ہشت ہزاری منصب، ہشت ہزار سوار و ماہی و مراتب اور مورچھل و طاؤس عطا کئے گئے۔ اور ان کی رہائش کے لئے شمشیر جنگ کی حویلی جو بلدہ کی چوک میں واقع ہے دی گئی اور کئی روز تک ان کو خلوت مبارک میں ٹھیرایا گیا۔

ان کی سیاسی زندگی کی ایک اور آخری منزل ٹیپو کی چوتھی جنگ ہے۔ جنگ کھرلہ کے بعد انگریزوں کی بیوفائی اور بدعہدی سے بدگمان ہو کر آصفجاہ ثانی نے اپنی توجہ فرانسیسیوں کی طرف مبذول فرمائی۔ موسیو ریمن کو فوج کی تیاری کے لئے ملازم رکھ لیا گیا تھا اور اس طرح دربار حیدرآباد میں انگریزوں کی ایک مخالف جماعت موجود تھی جب اعظم الامرا پونا سے واپس ہوئے تو جنوبی ہند کی سیاست بدلی ہوئی تھی انگلستان نپولین اعظم سے برسر پیکار تھا اور ہندوستان میں انگریزوں کا سر کچلنے کے لئے ٹیپو سلطان

سے جو انگریزوں کا جانی دشمن تھا، نامہ و پیام جاری تھے۔ انگریزوں نے ولزلی کو ہندستان بھیجا، اس نے دیکھا کہ حیدرآباد جیسے مقتدر دربار میں فرانسیسیوں کا اثر انگریزوں کے وجود کے لئے بیحد خطرناک ہے، اس لئے اس نے کوشش کی کہ کسی طرح حیدرآباد سے فرانسیسیوں کے اثر کو خارج کرے نواب اعظم الامرا اور ان کے مشیر کار میر عالم[1] انگریزوں کے طرفدار تھے۔ ان کی طرفداری اور موسیو ریموں کی موت نے ولزلی کو اپنے منصوبوں میں کامیاب بنادیا۔ موسیو ریموں کی پساندہ فوج برخاست کردی گئی۔ عہد معاونت کی رو سے ١٧٩٨ء میں حیدرآباد کی فوج میسور کی تباہی میں انگریزوں کی فوج کے شریک تھی اور ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ١٧٩٩ء اس کے مال غنیمت میں حیدرآباد کو برابر کا حصہ دیا گیا اور ولزلی نے خوش ہو کر انھیں ایک لاکھ سالانہ پنشن دینا منظور کیا۔

آصفجاہ ثانی کے انتقال کے بعد صرف دو ماہ سکندر جاہ کی وزارت کرسکے، اور ۲۸ محرم الحرام ۱۲۱۹ھ روز چہارشنبہ بعارضہ تپ انتقال ہوا۔ اپنی ۶۳ سالہ زندگی میں انھوں نے ۲۵ سال وزارت عظمیٰ کا کام انجام دیا۔ ان کی نعش کو سرور نگر کے اس باغ میں دفن کیا گیا جہاں ان کے مرحوم صاحبزادے عالی میاں دفن تھے۔

انھوں نے اپنے ولی نعمت کی آخر تک خدمت کی اور ملک کو ہر مشکل مرحلہ سے بچایا۔ وزارت عظمیٰ پر فائز ہونا خود ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے۔ مرہٹوں کے تنہا حریف تھے جنگ کھرڈلہ کی بے عزتی کے داغ کو مٹانے میں ان کی عظیم الشان خدمت ناقابل فراموش ہے اگرچہ تاریخ دکن ہشیار وزرا کے قابل قدر کارناموں سے مزین ہے لیکن انھوں نے جو نمایاں کام انجام دیئے جس کی وجہ سے انھیں ارسطو جاہ[1] اور فرزند ارجمند جیسے خطابات عطا ہوئے

---

[1] جاہ کا خطاب صرف شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھا لیکن یہی غیر شاہی خاندان کے واحد فرد ہیں جنھیں جاہ کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

ان کی مثال تاریخ دکن میں نہیں ملتی اور انھیں خطابات سے ان کی حقیقی شخصیت واضح ہوتی ہے
ملک میں ان کی اس قدر عزت کی جاتی تھی کہ بڑے بڑے امیر ان کی پالکی کے ساتھ پیدل چلتے تھے

اخلاق و عادات از حد دلی کا مجسمہ، خوش مزاج و بذلہ سنج ہونے کے علاوہ کبھی ذاتی امور کو امور مملکت پر ترجیح نہ دی۔ ہمیشہ اپنے ملک کے فائدہ اور ملک گیری میں مصروف رہتے۔ دیندار اور عبادت گزار تھے۔ پنجگانہ فریضہ نماز کے علاوہ کبھی تہجد کی قضا نہ ہوتی تھی۔ محرم میں بے حد تکلف کے ساتھ طلائی و نقرئی علم استادہ کرتے تھے۔ علوم و فنون سے دلچسپی رکھتے اور عالموں کی سرپرستی فراخدلی سے کرتے۔ جوانی میں گھوڑے سواری میں کمال حاصل کیا تھا۔ گھوڑوں کی خریدی کا بیحد شوق تھا۔ عمر ۷۰ سال سے متجاوز ہونے کے باوجود بھی اس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس کے علاوہ پتنگ بازی کا بھی انھیں بہت شوق تھا۔ اس کے لئے لوگوں کو جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ کبوتروں سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ ہزارہا روپیہ صرف کرکے دور دراز مقامات سے کبوتر طلب کئے جاتے تھے۔ خوشبودار تمباکو، حقہ اور حمیدہ کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ ان کے حقہ کی تمباکو کی خوشبو زبان زد خاص و عام تھی۔ کبھی سہ شنبہ کو مرغ بازی و لوا بازی ناغہ نہ ہوتی تھی۔ شطرنج اور چوپڑ سے بھی دلچسپی تھی۔ وقت مقررہ پر افسانہ گو حاضر ہو کر قصے سناتے تھے۔ علماء، فضلا اور شعرا کی صحبت رہا کرتی تھی۔ علمی صنائع و بدائع کو خوب سمجھتے اور لطف اٹھاتے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ شان و شوکت و متانت و وجاہت اور امیری رئیسانہ امارت پر ختم تھی۔[1]

محمد امیر

۱؎ گلزار آصفیہ

عہدہ داران بزم تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ

سال	صدر	نائب صدر	مدیر	معتمد	نائب معتمد	خازن
سنہ ۱۳۲۹ف	قاضی بدیع الدین (۱)			محمد صلاح الدین (۲)		
سنہ ۲۹ تا ۱۳۳۰ف	محمد صلاح الدین (۲)			سید احمد علی (۳)		
میقات اول سنہ ۲۹ تا ۱۳۳۰ف	سید معین الدین قریشی (۴)			پانڈو جی ڈہگے (۵)		
میقات دوم سنہ ۳۰ تا ۱۳۳۱ف	میر سیادت علیخان (۶)			محمد عبدالمجید صدیقی (۷)		میر محمود علی (۸)
سنہ ۳۱ تا ۱۳۳۲ف	محمد اکبر علیخان (۹)	سید ابراہیم احمد رضوی (۱۰)		محمد عبدالمجید صدیقی (۷)		ہنمنت راؤ ملیکر (۱۱)
سنہ ۳۲ تا ۱۳۳۳ف	محمد عبدالمجید صدیقی بی۔ اے (۷)	ممتاز علی ہاشمی (۱۲)		عزالدین محمد عبدالعزیز (۱۳)		مدن موہن لعل (۱۴)
سنہ ۳۴ تا ۱۳۳۵ف	خواجہ منیرالدین بی۔ اے (۱۵)	عبدالمنعم سعیدی بی۔ اے (۱۶)		غازی الدین (۱۷)		محمد یامین زبیری (۱۸)
سنہ ۳۵ تا ۱۳۳۶ف	سید ضیاء العارفین رضوی بی۔ اے (۱۹)			محمد نذیرالدین (۲۰)		ج، ب، بہان
سنہ ۳۶ تا ۱۳۳۷ف	محمد نذیرالدین (۲۰)			یوسف الدین احمد (۲۱)		محمد بشیر محی الدین
سنہ ۳۷ تا ۱۳۳۸ف	نبی الحسن تبسم (۲۲)			خواجہ حمید احمد		احمد عبدالحی؛ بی۔ این چوبے (۲۴)
سنہ ۳۸ تا ۱۳۳۹ف	خواجہ حمید احمد	بی۔ این چوبے؛ احمد عبدالحی	سید یوسف الدین قادری	محمد فاروق (۲۳)	مرزا محمود علی بیگ	احمد عبدالحی
سنہ ۳۹ تا ۱۳۴۰ف	محمد فیض الدین	محمد فاروق؛ شنکر جی	سید سراج الدین (۲۵)	سید محمود علی	اصغر حسین	ہرموہن لعل

سنہ ۴۰ تا ۱۳۴۱ف	محمد اکبر وفا قانی (۲۶)	احسن عزیز	خواجہ حمید احمد	مسعود یزدانی	ہر موہن لعل	رام سنگھ
سنہ ۴۱ تا ۱۳۴۲ف	مرزا محمود علی بیگ	محمد اعظم	محمد احسن (۲۸)	شنکر راؤ (۲۷)	رضی الدین	وسیل الدین -
سنہ ۴۲ تا ۱۳۴۳ف	محمد ناصر الدین احمد (۲۹)	خواجہ برکت اللہ	ابو نصر خالدی (۳۰)	محمد رفیق الدین احمد -	چنگوپہ کر (۳۱)	سید محمد مرتضیٰ - (۳۲)
سنہ ۴۳ تا ۱۳۴۴ف	محمد رفیق الدین احمد (۳۳)	ایشور چند بودیا ساگر (۳۴)	محمد عبد الوہاب مسلم (۳۵)	ہنمنت راؤ ماتوی کر	میر عباس علیخان	جمیل احمد برنی (۳۶)
سنہ ۴۴ تا ۱۳۴۵ف	ایشور چند بودیا ساگر		محمد عبد الوہاب مسلم	ہنمنت راؤ ماتوی کر (۳۷)	میر عباس علیخان	جمیل احمد برنی

(۱) حال امین کروڑگیری سرکار عالی (۲) بی۔ اے فلسفہ (عثمانیہ) ام۔ اے (ڈھاکہ) پروفیسر جامعہ عثمانیہ (۳) بی۔ اے۔ ال۔ ال بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ (۴) ام۔ اے (عثمانیہ) سابق مدیر مجلہ عثمانیہ۔ صدر مدرس مدرسہ آصفیہ
(۵) بی۔ اے فلسفہ (عثمانیہ) ام۔ اے (ڈھاکہ) (۶) مولوی فاضل ام۔ اے تاریخ ال ال بی (عثمانیہ) ڈی فل (اکسفورڈ) بی سی۔ ال پروفیسر شعبہ قانون جامعہ عثمانیہ (۷) ام۔ اے تاریخ۔ ال ال۔ بی (عثمانیہ)
مددگار معلم تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ۔ ناظم بزم تاریخ۔ (۸) ام۔ اے (عثمانیہ) معلم تاریخ سٹی کالج حیدرآباد (۹) بی۔ اے تاریخ (عثمانیہ) ال ال۔ بی (لندن) بیرسٹر اٹ لا، ایڈوکیٹ عثمانیہ عدالت عالیہ لکچرار قانون
کلیہ جامعہ عثمانیہ (۱۰) بی۔ اے تاریخ ال ال بی (عثمانیہ) تحصیلدار علاقہ سرکار عالی (۱۱) بی۔ اے تاریخ ال ال بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ (۱۲) بی۔ اے تاریخ (عثمانیہ) تحصیلدار ملک سرکار عظمت
صوبہ متوسط (۱۳) بی۔ اے تاریخ (عثمانیہ) (۱۴) بی۔ اے۔ تاریخ (عثمانیہ) (۱۵) ام۔ اے تاریخ (عثمانیہ) معلم تاریخ سٹی کالج حیدرآباد (۱۶) بی اے (علیگ) ال ال بی (عثمانیہ)
(۱۷) بی۔ اے تاریخ (عثمانیہ) ایچ سی ایس منصف (۱۸) بی۔ اے تاریخ ال ال۔ بی عثمانیہ (۱۹) بی۔ اے تاریخ ال۔ ال۔ بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ (۲۰) بی۔ اے تاریخ (عثمانیہ)
(۲۱) بی۔ اے تاریخ (عثمانیہ) ایچ سی ایس دوم تعلقدار۔ (۲۲) بی۔ اے تاریخ (عثمانیہ) تحصیلدار علاقہ سرکار عالی (۲۳) بی۔ اے تاریخ (عثمانیہ) منتخب شدہ ایچ سی۔ ایس کلاس (۲۴) بی۔ اے
ال۔ ال۔ بی (عثمانیہ) مولف سوال و جواب امتحان ال۔ ال۔ بی قانون اصول ضمانت و شرح قانون آبکاری (۲۵) ایم۔ اے (عثمانیہ) مددگار معلم تاریخ (جامعہ عثمانیہ)۔ (۲۶) بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی
(عثمانیہ) مدیر حسن کار۔ (۲۷) بی۔ اے (عثمانیہ) پروبیشنر تحصیلدار علاقہ سرکار عالی (۲۸) بی۔ اے ال۔ ال۔ بی عثمانیہ متعلم ایم۔ اے۔ (۲۹) بی۔ اے (عثمانیہ) پروبیشنر تحصیلدار علاقہ سرکار عالی
(۳۰) ایم۔ اے (عثمانیہ) ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ (۳۱) بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی (عثمانیہ) (۳۲) بی۔ اے عثمانیہ متعلم ایم۔ اے (۳۳) بی۔ اے (عثمانیہ) (۳۴) بی۔ اے عثمانیہ متعلم ایم۔ اے (۳۵) بی۔ اے عثمانیہ متعلم ایم۔ اے (آخری)۔
(۳۶) بی۔ اے عثمانیہ متعلم ال۔ ال۔ بی۔ (۳۷) بی۔ اے (عثمانیہ) متعلم ایم۔ اے (ابتدائی)

شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ

علمی تحقیقات اور تخلیقی کام میں شعبۂ تاریخ کسی دوسرے شعبہ سے پیچھے نہیں چنانچہ اس شعبہ کے اساتذہ اور طیلسانی طلبہ علمی تحقیقات میں مصروف نظر آتے ہیں۔

صدر شعبہ پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی کچھ عرصہ سے اسلامی نظریات سیاسی کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں اور پچھلے برسوں میں متعدد مضامین شائع کر چکے ہیں جنھیں ایک جگہ اکٹھا کر کے امید ہے کتابی شکل میں شایع کیا جائیگا۔ علاوہ مختصر تاریخ دکن کے جو چھپ چکی ہے موصوف نے تاریخ دکن پر بھی مندرجہ ذیل مضامین لکھے ہیں۔

(۱) "محمود گاواں کا نظم و نسق اور سیاسی مسلک"۔ کرشنا سوامی آئنگر کے مداحوں اور احباب نے جو جلد انھیں پیش کی ہے اور جس میں ہندوستان کے بعض مشہور مورخوں نے مضامین لکھے ہیں اُس میں شیروانی صاحب کا یہ مضمون بھی شائع ہوا ہے۔

(۲) "خواجہ جہاں کی مہاراشٹر کی مہمات"۔ یہ مضمون انڈین ہسٹاریکل کانفرنس منعقدہ پونا سنہ ۱۹۳۴ء میں پڑھا گیا تھا۔

(۳) "پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں دکھنی تدبیر حکومت اور اوس کے طریقہ ہائے عمل" یہ مضمون آل انڈیا اورینٹل کانفرنس منعقدہ میسور سنہ ۱۹۳۵ء میں پڑھا گیا تھا۔ اسلامی نظریات سیاسی کی تحقیق کے سلسلہ میں موصوف نے "غزالی کے سیاسی نظریات" پر ایک عالمانہ مضمون شایع کیا ہے

پروفیسر جمیل الرحمٰن صاحب نے المانی مستشرقین فان کریمر، وائل اور بکر کی تصانیف کے بعض اہم حصوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کے ماسوا موصوف نے اسلامی سیاست

کے متعلق حیدرآباد کے رسالہ " دی قرآنک ورلڈ" میں تین مضامین شائع کئے ہیں،
جن میں داد تحقیق دی گئی ہے۔

پروفیسر رائے سکسینہ صاحب نے ولائل برن کی کتاب "پولٹیکل آئی ڈیلز" کا ترجمہ کرکے
حیدرآباد ہی میں چھپوا کر شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب نے نظام الملک آصفجاہ اول بانی ریاست حیدرآباد
کے متعلق اپنی تحقیقات ختم کرلی اور اُس کے نتائج کتابی شکل میں شائع ہوگئے۔ یہ کتاب آصفجاہ
اول کی سوانح عمری کے علاوہ اس زمانہ کی تقریباً پچیس سال کی تاریخ دکن پر حاوی ہے۔
ہندوستان کے اکثر وقیع اخبارات نے اس پر اچھے اچھے تبصرے لکھے ہیں۔

پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب نے مندرجہ ذیل بلند پایہ تحقیقی مضامین شائع کئے ہیں۔
سلطان قلی بانی گولکنڈہ، جمشید قلی، ابوالحسن تاناشاہ کی تخت نشینی، ابراہیم قطب شاہ تخت نشینی سے پہلے، تسخیر گولکنڈہ۔
موصوف نے آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس منعقدہ میسور میں بھی ایک مضمون "بہمنی سلطنت" پر پڑھا تھا۔

ڈاکٹر ٹوپا صاحب اسلامی ملوکیت پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔

مولوی سراج الدین احمد صاحب نے حسب ذیل مضامین لکھے:۔

(۱) " علاؤالدین خلجی کی حکمت عملی اور سیرت" جو جامعہ عثمانیہ کے مجلہ تحقیقات علمیہ میں شائع ہوا۔
(۲) "بابر کا ہندوستان آنا" مجلہ عثمانیہ میں شائع ہوا۔

اساتذہ شعبہ کے علاوہ طلبہ بھی علمی تحقیقات میں مصروف ہیں۔ سال گذشتہ حسب ذیل
طلبہ نے تحقیقاتی مقالے لکھے۔

ایم۔ اے۔ ابو نصر خالدی صاحب "سیاست نامہ نظام الملک طوسی"
" " ونکٹ راؤ صاحب۔ "تھدجی سندھیا"

ریسرچ :۔ سید علی محسن صاحب "تسخیر گولکنڈہ" ۔

امسال طلبہ حسب ذیل مقالوں کی تیاری میں مصروف ہیں ۔

ایم ۔ اے :۔ شہاب الدین صاحب "ہندوستانی ریاستوں اور مرکزی حکومت کے درمیان تعلقات"

" " اشوک چندر رو دیاساگر صاحب "ہندوستان میں مقامی ادارات کا ارتقاء" ۔

" " محمد عبدالوہاب صاحب مسلم "فتح گولکنڈہ"

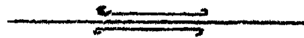
ریسرچ :۔ ابونصر خالدی صاحب "عہد خلیفہ عبدالملک ابن مروان"

سال گزشتہ شعبۂ تاریخ کے متعلقہ امتحانات کے نتائج حسب معمول نہایت درخشاں رہے

امتحان انٹرمیڈیٹ میں منجملہ ۵۱ طلبہ کے مضامین تاریخ میں صرف ۶ ناکام رہے ۔ اور بی ۔ اے میں منجملہ ۳۱ کے ۱۱ کو درجہ دوم میں کامیابی حاصل ہوئی اور صرف ۳ ناکام رہے ۔ ایم ۔ اے (ابتدائی) میں منجملہ تین امیدواروں کے تینوں کامیاب ہوئے اور ایم ۔ اے (آخری) میں دو امیدوار شریک ہوئے جس میں سے ایک درجہ دوم اور ایک درجہ سوم میں کامیاب ہوا گویا کہ منجملہ ستاسی امیدواروں کے جو جامعہ کے مختلف امتحانوں میں بیٹھے مضامین تاریخ میں صرف ۹ ناکام رہے جس سے کامیابی کا اوسط ۹۴ فیصد ہوتا ہے ۔ یہ نتائج اساتذہ و طلبہ دونوں کے واسطے قابل مبارکباد ہیں ۔

امسال مولوی بشیر حسین صدیقی صاحب بی ۔ اے (عثمانیہ) حیدرآباد سول سروس میں منتخب ہوئے ۔ سید کرار علی صاحب "جوبلی طلائی تمغہ" عطیہ جناب ہارون خان شیروانی صاحب پانے کے مستحق قرار پائے اور سید علی محسن صاحب ریسرچ اسکالر کا مضمون خزینہ میں طلبہ کے لکھے ہوئے مضامین میں اول قرار پایا ۔ بزم تاریخ ان حضرات کو مبارکباد پیش کرتی ہے ۔

مدیر



عہدہ داران بزم ۱۳۴۶ تا ۱۳۴۷ ف

صدر ناظم

پروفیسر ہارون خاں شیروانی ایم۔اے (دکن) بارایٹ لا۔ ایف۔آر۔ایچ۔ایس (لندن)

ناظم مستوفی

پروفیسر جمیل الرحمٰن ایم۔اے (پنجاب)

ناظم ادارہ

ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ ڈی۔لٹ (پیرس)

نظار

پروفیسر کرشن چندر رائے سکسینہ ایم۔اے (الہ آباد)

پروفیسر عبدالمجید صدیقی ایم۔اے ال۔ال۔بی (عثمانیہ)

ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا پی۔ایچ۔ڈی

مولوی سراج الدین احمد ایم۔اے ارسرتج (عثمانیہ)

صدر:۔ سید محمد مرتضیٰ متعلم ایم۔اے

نائب صدر:۔ خواجہ عیسیٰ احمد متعلم ایم۔اے

معتمد:۔ عبدالعلی خاں

نائب معتمد:۔ احمد صدیقی

خازن:۔ ونکٹ راؤ لاٹکر

مدیر:۔ شاہ حسین رزاقی

اراکین

میر عباس علیخاں　　سید احمد نہری　　منیر الدین　　احمد اللہ

شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ

علمی تحقیقات اور تخلیقی کام میں شعبۂ تاریخ کسی دوسرے شعبہ سے پیچھے نہیں چنانچہ اس شعبہ کے اساتذہ اور طیلسانی طلبہ علمی تحقیقات میں مصروف نظر آتے ہیں۔

صدر شعبہ پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی کچھ عرصہ سے اسلامی نظریات سیاسی کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں اور پچھلے برسوں میں متعدد مضامین شائع کر چکے ہیں جنھیں ایک جگہ اکٹھا کر کے امید ہے کتابی شکل میں شایع کیا جائیگا علاوہ مختصر تاریخ دکن کے جو چھپ چکی ہے موصوف نے تاریخ دکن پر بھی مندرجۂ ذیل مضامین لکھے ہیں۔

(۱) "محمود گاواں کا نظم و نسق اور سیاسی مسلک"۔ کرشنا سوامی آئنگر کے مداحوں اور احباب نے جو جلد انھیں پیش کی ہے اور جس میں ہندوستان کے بعض مشہور مورخوں نے مضامین لکھے ہیں اُس میں شیروانی صاحب کا یہ مضمون بھی شائع ہوا ہے۔

(۲) "خواجہ جہاں کی مہاراشٹر کی مہمات"۔ یہ مضمون انڈین ہسٹاریکل کانفرنس منعقدہ پونا سنہ ۱۹۳۴ء میں پڑھا گیا تھا۔

(۳) "پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں دکھنی تدبیر حکومت اور اوس کے طریقہ ہائے عمل" یہ مضمون آل انڈیا اورینٹل کانفرنس منعقدہ میسور سنہ ۱۹۳۵ء میں پڑھا گیا تھا۔ اسلامی نظریات سیاسی کی تحقیق کے سلسلہ میں موصوف نے "غزالی کے سیاسی نظریات" پر ایک عالمانہ مضمون شایع کیا ہے۔

پروفیسر جمیل الرحمن صاحب نے المانی مستشرقین، فان کریمر، وائل اور بکر کی تصانیف کے بعض اہم حصوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کے ماسوا موصوف نے اسلامی سیاست